

# مسافروں کے لمحے

ماہا ملک

تیز چمکدار دھوپ ہر منظر چکا چونڈ سر کیس پتی ہوئی آسمان سے شاید آگ برس رہی تھی۔ جس چیز کو ہاتھ لگایا وہ گرم۔  
”اسے تو بخار ہے بلکہ سر سام ہوگا۔“ پروانے بلوریں صراحی کو ہاتھ میں لے کر فوراً کاونٹر پر رکھ دیا۔ بھا بھی  
نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

بھا بھی اور صدف کی مشترکہ دوست انیلا کی شادی تھی اور اس کے لیے تحائف لینا تھے۔ بھا بھی تو بہت نازک  
مزاج تھیں۔ دوپہر کا وقت ان کے آرام کا تھا مگر صدف آگئی تھی۔ اسے گرمی کا احساس اتنا نہ تھا جیسا کہ بھا بھی کو۔  
صدف نے ان کا عذر سن کر کہا۔

”گرمی میں گرمی ہی ہوگی۔ سردی تو ہو نہیں سکتی۔ شادی بھی گرمی میں ہے۔ تو کیا دنیا کے سارے کام رک  
جائیں۔ چلو اٹھو کاپل کہیں کی۔“

بھا بھی صدف سے اختلاف نہیں کر سکیں۔ وہ نئی نئی دوست بنی تھی۔ بھا بھی کی نئی نویلی دوستی خاصی ہنگامہ پرور  
ہوتی تھی۔ شروع میں تو خوب دعوتیں آنا جانا بلانا لگاؤٹ، خاطریں پھر رفتہ رفتہ دوستی کا ابال تہہ میں چلا جاتا۔ ختم ہو  
جاتا، مجبوری، مصلحتیں اور بہانے بنا کر وہ کسی نئے شکار کو تاک لیتیں۔ ان کی دوستی کا معیار خاصا بلند تھا۔ کوئی ایڈوانس  
دولت مند یا آزاد منش جاب کرنے والی لڑکی۔ جوان کی سالگرہ پر قیمتی تحفے دے سکے۔ انہیں اپنی کار میں یہاں وہاں  
لے جایا کرے۔ ہوٹلنگ کی سکت رکھتی ہو۔ اس سب کے علاوہ ان کی شادی شدہ زندگی پر اظہار تاسف بھی کر سکے۔ جو  
ماں باپ کے غلط فیصلوں کے باعث ملازم پیشہ متوسط طبقے کے نو جوان سے بیاہ دی گئی تھیں۔

بھا بھی کی اپنے میکے کے بارے میں مبالغہ آمیزی کی اڑان بھی کافی بلند تھی۔ کبھی کوئی پوچھ بھی لیتا کہ آخر اتنے  
بڑے گھرانے کی بیٹی کی اتنے چھوٹے گھر میں شادی کی کیا وجہ تھی تو بھا بھی اس سے ناراض ہو جاتیں۔ انہیں اپنی کہنے  
کی عادت تھی سننے کا حوصلہ نہ تھا۔ بے حد تنگ مزاج بلکہ بد مزاج تھیں۔ اسی لیے عمران سے دب کر رہ گئے تھے۔

اور پروا سوچ رہی تھی کہ خواجواہ بھابھی کی پیشکش پر خوش ہو کر ان کے ہمراہ بازار آگئی۔ اس پیش اور گرمی کی جھلسن میں لو کے تھپڑے کھا کھا کر اسے خود بخار سا ہونے لگا تھا۔ مزے سے تنہائی میں اپنے کمرے میں لیٹی ناول پڑھتی۔ اس کے کمرے کی پناہ بھی کسی دولت سے کم نہ تھی۔ نعمت تھی لیکن اب تو وہ آہی گئی تھی۔ بھابھی کی مہربانی کہ وہ اسے اپنے ساتھ لانے میں شرم محسوس نہیں کر رہی تھیں ورنہ جب عمر بھابھی کے ساتھ بھابھی کے ہمراہ آتی تو انہیں بار بار اس کی وجہ سے ہتک کا احساس ہوتا۔ وہ مسلسل بڑبڑاتی رہتی تھیں۔

خیر ناگواری تو انہیں آج بھی ہو رہی تھی۔ شاید وہ بچھتا رہی تھیں۔ صدف کی وجہ سے خاموش تھیں۔ یا پھر دوکانوں میں جی خوبصورت جھجھاتی اشیاء نے ان کا منہ بند کر دیا تھا۔ البتہ وہ پسندیدگی کا اظہار ضرور کرتی تھیں۔

”ہائے کتنا دل چاہتا ہے کہ ایسے ڈیکوریشن پیس میرے پاس بھی ہوں۔ اوہو کتنا پیارا ڈیزائن ہے۔ امی کے پاس تو بہت قیمتی بے شمار چیزیں ہیں۔ پاپا فارن سے لاتے ہیں۔ ایسے ایسے نمونے کہ کیا بتاؤں۔“

”تو پاپا تمہارے لیے نہیں لاتے۔ تم مانگ لیا کرو تا۔“

صدف نے بے دھڑک جھرجھری سی لی۔ کپکپانے لگی۔ صدف اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”کیا ہوا پروا۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ صدف فکر مند ہو گئی کہ کہیں اسے لونہ لگ گئی ہو۔ بھابھی ناگواری سے گھورنے لگیں۔ وہ جھینپ گئی۔

”دراصل جب بہت گرمی لگتی ہے تا۔ تو میں تصور کرتی ہوں کہ شدید سردی ہے اور میں سردی سے کانپ رہی ہوں۔ تو اس طرح گرمی سے کچھ نجات مل جاتی ہے۔“

وہ شرما کر مسکرا دی۔ صدف دلچسپی سے اس کو دیکھ رہی تھی۔

”اور سردی میں۔“

”سردی میں سوچتی ہوں کہ شدید گرمی لگ رہی ہے۔ تو پسینہ آ جاتا ہے۔“ وہ پھر جھینپ گئی۔

صدف مسکراتے ہوئے سوچتی نظروں سے اسے دیکھنے لگی معصوم اور کمزور سی لڑکی۔ بادامی آنکھوں میں قناعت کی چمک۔ صبر و شکر کا نمونہ۔ گرم ہوانے اس کے سنہری چہرے پر سرخی سی دوڑا دی تھی۔ صدف کو اپنی دوست بسمہ کی یہ نند اس وقت بے حد پیاری لگی بالآخر تحائف خرید کر پیک کر لیے گئے۔ واپس آتے ہوئے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے صدف نے مڑ کر پروا سے کہا۔

”واقعی پروا۔ بڑا عجیب تجربہ ہے۔ ابھی اس تنور جیسی گرم گاڑی میں بیٹھتے ہوئے میں نے خود کو ایک آتش دان

کے سامنے بیٹھنے اور سردی سے کانپنے کا تصور کیا۔ تو واقعی جھنجھری آگئی۔ سردی تلنے لگی۔“

پرواہنس پڑی۔ بھابھی نے مڑ کر اسے گھورا۔

”اب سردی میں بھی تجربہ کر لیں گے۔ کیوں بسمہ۔ تم اپنی نند کے تجربوں سے فائدہ نہیں اٹھاتیں۔“ صدف نے بسمہ کی طرف دیکھا۔ وہ منہ موڑ کر بڑبڑانے لگی۔

گھر آتے ہی پرواہ نے جلدی سے شربت بنا کر دونوں کو پیش کیا۔ صدف نے ہنس کر کہا۔

”ارے اتنی سخت سردی میں برف کا شربت۔“ اور اس نے جھنجھری سی لی۔

”اچھا تو میں چائے بناتی ہوں۔“ پرواہ بھی مسکرائی۔

”نہیں تمہیں زحمت ہوگی۔ میں چلتی ہوں۔ ذرا آرام کر لوں۔ رات میری فلائٹ ہے۔“

صدف کے جانے کے بعد شام ہونے تک بھابھی نے اسے سینکڑوں باتیں سنا ڈالیں۔ دراصل غصہ انہیں صدف پر آ رہا تھا کہ وہ پرواہ سے کیوں بے تکلفی برت رہی تھی اور ان کے حسرت آمیز کلمات پر نہ تو اس نے وہ ڈیکوریشن پیس ہی از راہ مہربانی انہیں لے کر دیا نہ وہ چمکتا ہوا گلدان۔ جبکہ اس سے پہلے تو کبھی دوست ان پر ان کی حسرت ناک زندگی پر ترس کھا کر کوئی نہ کوئی خوبصورت چیز تھنے کے نام پر لے دیتی تھیں۔ جو وہ ہزاروں اصرار کے بعد تکلفاً محض دوستی کی خاطر، خلوص اور پاکیزہ جذبے کی قدردانی کے طور پر لے لیتی تھیں، ورنہ ان کا مقصد تو یہ نہ تھا۔ مگر صدف نے کوئی فالتو چیز نہ لی۔ آخر وہ ایئر ہوسٹس تھی، خاصی شان سے رہتی تھی۔ اکیلی اور خود مختار۔ اس کی کمائی بھی بہت تھی۔ خیر امید یہ دنیا قائم ہے کے مصداق اب وہ اس کے بیرون ملک دورے پر آس لگا بیٹھیں۔ باہر سے شاید کچھ لے آئے۔ شام کو عمر بھائی آئے تو بھابھی نے انہیں پرواہ کی حماقت کا حال سنایا۔

”اس قدر بولتی ہے تمہاری بہن کیا ضرورت تھی اس کے سامنے اپنا فقیرانہ تجربہ بیان کرنے کی۔ اتنی شرمندگی ہوئی مجھے کہ بس۔ اسے کیا ضرورت کہ یہ تجربہ کرے۔ گرمی لگے گی تو اے سی میں بیٹھے گی۔ سردی ہوگی تو بیٹر جلا لے گی، کیا سوچتی ہوگی وہ میرے بارے میں کہ کس گھٹیا نچلے درجے کے خاندان میں شادی ہوئی ہے میری۔ جو گھر میں کولر تک نہیں لگا سکتے یا میں پرواہ کو دانستہ گرمی میں رکھتی ہوں۔ ایک پرانا کولر لگا ہے میرے کمرے میں۔ اے سی تھے ہمارے گھر میں۔ کبھی میں نے فرمائش کی کہ مجھے اے سی چاہیے مگر یہ۔ ہر جگہ مجھے ذلیل کرتی ہے۔“ وہ رونے لگیں۔

پرواہ کا ان کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ بات کو کہیں سے کہیں پہنچانا بھابھی کا کمال تھا۔ عمر بھائی نے بھی غور کیے بغیر مڑ کر پرواہ کو ہی ڈانٹا۔

”کیوں بکواس کرتی ہو تم۔ تمہیں کیا ضرورت تھی ان کے ساتھ جانے کی۔“

پردہ بھابی سے زیادہ بھائی کی بات پر حیران ہوئی۔ وہ جانتے تھے کہ نہ تو پردہ کو بکواس کرنے کی عادت تھی۔ نہ سیرت فریح کی وہ شائق تھی۔ پھر بھی بیوی کی دلجوئی کے لیے خفگی کا اظہار کر رہے تھے۔

ڈبڈبائی آنکھیں جھکا کر اس نے چپکے سے کہا۔ ”اب نہیں جاؤں گی۔“ اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔  
بھائی کو معلوم تھا وہ دوسرے کمرے میں جا کر روئے گی اور بھڑاس نکالے گی مگر وہ اس کے پیچھے نہ آیا اور بیوی کی ہی دلجوئی کرتا رہا۔

”اچھا۔ اچھا ڈانٹ تو دیا ہے میں نے اسے ذرا کم عقل ہے۔“

”کم عقل۔“ بھابی چیخیں۔ ”اس کی چالاکی آپ کو پتا نہیں نا۔ جنتی ہے۔ میسنی ہے پوری۔۔۔۔۔“

بھابی اس کی چالاکی کے من گھڑت قصے سناتی رہیں۔ وہ اپنے پلنگ پر بیٹھی سوچتی رہی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ لوگ بدل جاتے ہیں۔ یہ وہی بھائی تو ہیں جس کے ساتھ بچپن سے جوانی تک کا اکٹھے سفر کیا تھا۔ وہ کتنے نخرے کرتی تھی اور بھائی اس کے ناز اٹھاتا تھا۔ کس طرح اس کے پیچھے پیچھے پھرتا تھا۔ اسے اس دیکھ کر کیسے مضطرب ہو جاتا وہ خفا ہوتی تو دنیا کی نعمتیں اس کے سامنے ڈھیر کر دیتا۔

”لو۔ یہ جار جٹ کا سوٹ تمہاری پسند کا لایا ہوں۔ آخری پیس رہ گیا تھا۔ اچھا لو ادھر۔ یہ دیکھو گلاب جامن لایا ہوں تازہ ہیں، فٹ کھا لو۔ منہ کھولو، منہ کھولو، ارے شیرا گرا۔“

جب تک وہ اپنے ہاتھ سے گلاب جامن اسے نہ کھلا لیتا چین نہ آتا۔ اسے گلاب جامن بہت پسند تھی۔ اسی لیے تو گھر میں گلاب جامن نہیں۔ برنی آتی تھی۔ بھابی کی پسند اور اس وقت بھی وہ بھابی کو برنی کھلانے کے لیے خوشامد کر رہے تھے۔

شام ہو گئی۔ بھائی کو بہن کے چہرے کی آزر دگی نظر آئی نہ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی۔ بلا وجہ اسے ڈانٹا تھا۔ مگر ندامت نہ تھی بلکہ سورج ڈوبتے ہی وہ بھابی کو سیر کرانے لے گیا کہ بیوی کا مزاج نارمل ہو۔ یہ بھابی کی عادت تھی تقریباً ہر روز کوئی نہ کوئی قضیہ نکال کر بیٹھ جاتیں عمر کے گھر میں جھتے ہی شکایتوں اور خفگی کے پٹارے کھل جاتے پھر شام بلکہ رات تک وہ بھابی کو منانے میں لگا رہتا۔۔۔۔۔ اور کہیں سیر کرانے لے جاتا۔ دوستوں کے گھر عزیزوں کے ہاں یا بھابی کے میسے۔ وہ اکیلی گھر میں بیٹھی انتظار کرتی رہتی۔ آج بھی کھانا پکا کر وہ انتظار میں بیٹھی رہی اور وہ رات کو ہوٹل سے کھانا کھا آئے۔ آتے ہی اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہ صحن میں لیٹی تارے تکتی رہی۔

نیلا آسمان کبھی کبھی سیاہ کیوں ہو جاتا ہے۔ چمکتا سورج بھی بادلوں میں آ کر دھندلا جاتا ہے۔ چاندنی کبھی میلنی کبھی اجلی کیوں لگتی ہے۔ زندگی کبھی دلچھپ کبھی روکھی پھینکی ہو جاتی ہے۔ اللہ نے سارے دن ساری راتیں ایک جیسی نہیں بنائیں۔ اسی طرح دنیا کے باسی بھی جب چاہتے بدلتے موسموں کا رنگ اوڑھ لیتے۔ خوش ہیں تو بہار کی رنگینی ہمراہ ہے پھولوں کی طرح کھلے جا رہے ہیں۔ رنجیدہ ہوئے تو ساون کی گھٹاؤں کی ردا اوڑھ لی۔ ایک اشارہ ملا کہ جھما جھم برسنے لگے۔ شکایت ہوئی تو موسم گرما جیسی جھلسنے والی زبان اختیار کر لی۔ یا پھر بیزار ہوئے تو یوں جیسے جس کا پیرا بن پہن لیا۔ یکسانیت اچھی نہیں۔ مگر یہ کیا کہ نہ موسم ایک جیسے نہ حالات۔ رشتے نہ رویے نہ تعلق۔ زمانہ سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ کسی بھی انیسیت کا لحاظ کیے بغیر اور پھر جب حالات بدلنے کو ہوتے ہیں تو انسان مرجاتے ہیں۔ پھر زندہ لوگ بھی یادداشت گم ہونے کا بہانہ کیے بغیر آنکھیں چرا تے ہیں۔ فطرت کیسے بدلتی ہے۔ اس کی تحقیق تو کوئی کرتا نہیں۔ بیسویں صدی اور ایٹم کے تجربات کے سر ڈال کر سائنسی ایجادات کو کوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ پچھلی صدی کے ایثار پیشہ لوگ رگائیت اور خلوص کے سارے تعلق اپنے ساتھ قبر میں لے گئے یا وہ جادو گر تھے کہ ان کا علم ان کے ساتھ فنا ہو گیا۔



چند سال پہلے حالات اور تھے۔ بہار ہی بہار تھی خوشیاں آنگن میں چھلائیں لگاتیں۔ خوشبوؤں سے پورا جہان مہکتا۔ اماں! ابا! بھائی! بلکہ پورا خاندان اس کے ناز اٹھاتا۔ بچپن میں بیمار ہو گئی تھی نا۔ مرتے مرتے بچی۔ اماں کی تو اس میں جان تھی۔

”لڑکی ذات ہے۔ جانے کن حالات میں گزر کر ناپڑے۔ اسے اتنا نازک مزاج نہ بناؤ آپا۔“ ممانی آئی تھیں اسے بہو بنانے مگر اس کی قدر و منزلت عیش کوشی اور آرام طلبی دیکھ کر مایوس ہو گئیں۔

”لڑکیوں کو سخت موسموں کا عادی ہونا چاہیے۔“

ممانی کو خاصی تشویش تھی جو اس کمسنی میں ہی اس قدر نخرے کرتی تھی۔ گرمی کی برداشت تھی نہ سردی کی۔ گرمی میں اس کے لیے نہایت باریک لان کے سوٹ بنوائے جاتے۔ سردی میں کاٹن سے بدن چھلنے لگتا۔ لارنس پورٹل سے گرم سوٹ منگائے جاتے۔ اہتمام سے سلوائے جاتے کہ سلائی موٹی نہ ہو۔ جو اس کے نازک بدن کو ناگوار ہو۔

”ہماری ہما تو ریشمی کپڑے بناتی ہے۔ سردی گرمی وہی پہنتی ہے۔ کئی سال چل جاتے ہیں مضبوط کے مضبوط اور رنگ بھی پنہتہ۔“

ممائی اس کی ننھی سی ناک کو دیکھا کرتیں جو چڑھی رہتی تو بے..... اس لڑکی کا گزارا تو بادشاہوں کے گھر ہو سکتا ہے۔ ہم جیسے لوگ بھلا اس کے نخرے سہہ سکتے ہیں۔ اسے تو وائل بھی گرم لگتی۔ چچی اماں کراچی سے اس کے لیے بہترین باریک لان کے سوٹ بھیجا کرتیں جس کے ڈیزائن اور رنگ بھی حسین ہوتے۔ اماں کی فرمائش کے بغیر ہی کراچی سے اس کے لیے خوبصورت چوڑیاں، نئے ڈیزائن کی چلیں اور ہیل والے نازک سینڈل آ جاتے۔ چچی اماں کو اس کا بہت خیال تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے اماں سے وعدہ لے لیا تھا۔ ان کے تو چار بیٹے تھے اور بیٹی تو بس پرواہی تھی۔ دونوں گھروں کی مشترکہ چچی اماں نے تو اسے بہت دفعہ کراچی بلایا اور ہر بار وہ بے قرار ہو ہو گئی۔ مگر بس ایک یہی خواہش اماں نے پوری کر کے نہ دی۔

”اری۔ کیا شادی سے پہلے ہی سسرال جانے کا شوق ہے۔“

وہ ہنس کر کہتیں۔ تو وہ خفا ہو جاتی، اس کا جوش ٹھنڈا ہو جاتا۔ وقت بھی کیسا بے مہر ہے۔ ادھر اماں ابانج کے لیے سوار ہوئے اور وقت نے کروٹ بدلی۔ عرفات میں تو ہر سال ہی تیز ہواؤں کی بدولت آگ لگا کرتی ہے مگر اس سال آگ اور دھواں اس قدر طاقتور نکلتے کہ اس کے اماں ابا کو ہی نگل گئے۔ ادھر اس پر بھی جہنم کھل گیا۔ ابا اپنے ساتھ ساری خوشحالی لے گئے اور اماں کے ساتھ محبتیں فنا ہو گئیں۔ چاہتیں اڑ گئیں۔ نظریں بدل گئیں لوگوں کی۔ پاگلوں کی طرح وہ اماں ابا کو گھر کے گوشے گوشے میں پکارتی۔ ڈھونڈتی مگر بے جا وہ چیزیں خاموشی کی زبان میں اس پر ترس کھاتیں۔

ایک پھپھو تھیں۔ اس کی قدردان۔ ہر سال جب وہ ان کے گھر جاتی تو سب اسے آنکھوں پر بٹھاتی۔ پھپھو اپنی بیٹیوں کو سسرال سے بلا لیتیں تاکہ اس کا دل لگا رہے۔ پھو پھا جان اس کے لیے قصبے کے برف خانے سے آئس کریم قلعہ جھوا کر لاتے اصرار سے کھلاتے۔ نائلہ باجی نے ایک دن رشک سے کہا۔ ”ہائے۔ ابا نے ہماری تو کبھی اتنی خاطر نہ کی۔“ اس قدر مہر محبت کی فراوانی تھی کہ وہ سرشار ہو کر آتی اور مہینوں اسے پھپھو کے قصبائی ماحول کی سادگی اور خلوص یاد آتا مگر جب اماں ابا چلے گئے تو اسے کچھ یاد نہ رہا۔ اگر عمر بھائی نہ ہوتے ان کی دلجوئی، تسلیاں اسے زندگی کے قریب لاتی رہیں۔ پھر بھائی نے کاروبار شروع کیا لیکن بے ایمانی کے دور میں ان سے ان کا سرمایہ بھی چھین گیا اور وہ بھائی کی حالت دیکھ کر فکر سے بے دم ہو گئی تو پھپھو آ کر اسے اپنے ساتھ لے گئیں اور وہاں اس کی وہی پذیرائی ہوئی جو ہمیشہ سے ہوتی تھی مگر اب وہ بے حس اور ٹھس ہو گئی تھی۔ نہ کسی کی محبت اسے شاد کرتی نہ کسی کی بے وفائی سے متاثر ہوتی۔ اسے دنیا کے بدلتے رنگوں کا احساس ہو رہا تھا۔ اب وہ وقت نہیں رہا تھا۔

چچی اماں نے بیٹے کا بہانہ کر کے نام نہاد مشغلی بھی توڑ ڈالی اور سنا کہ وہ کسی بڑے گھر کی بیٹی کی تلاش میں ہیں۔ چچی اماں کی محبت اور شفقت پر اسے بہت بھروسہ تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ ان کے بیٹے سے منسوب ہو گئی تھی بلکہ اس لیے کہ انہوں نے ہمیشہ اسے اپنی بیٹی کہا اور سمجھا تھا وہ اس کے لیے ہر موسم کی چیز بھیجا کرتی تھیں۔ اس سے محبت کے اظہار کے لیے انہوں نے محض بناوٹی باتیں کبھی نہیں کیں۔ ان کے بدلنے کا اسے خاصا دکھ پہنچا۔

مدتوں وہ حیران رہی اور تب ہی سے اس نے کیا اور کیوں کے الفاظ کا سہارا چھوڑ دیا۔ وہ ایسے موقع پر چپ ہو جاتی اور بولنے کی تو اب عادت بھی نہیں رہی تھی۔ وہ تو دنیا کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی تھی لیکن عمر بھائی نے شاید ابھی تک حقیقت کو قبول نہ کیا تھا۔ تب ہی وہ دوستوں کی طوطا چٹنی کے نتیجے میں گھر کا سامان اور بچے کھچے اٹاٹے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

جب وہ گھر پہنچی تو ویرانی کا منظر تھا تمام فرنیچر غائب تھا۔ اس کا زیور بھی بھائی کے کاروبار کی نذر ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس کے جہیز کی الیکٹرک کی چیزیں بھی بک گئی تھیں۔ خالی کمرے بھائی بھائیں کر رہے تھے۔ ڈرائنگ روم کے قیمتی پردے تک نیلام ہو گئے تھے۔

”بھائی۔ اب کیا ہوگا۔ ہم کیسے رہیں گے۔“ وہ وحشت زدہ تھی۔

”جیسے میں رہ رہا ہوں گڑیا! تم فکر نہ کرو۔ اس نقصان سے مجھے دوستوں کی اصلیت کا تو پتا چل گیا نا۔ اب میں دوسروں کے سہارے سے نہیں خود اپنی ہمت اور کوشش سے محنت کروں گا۔ تمہیں بھی میرا ہاتھ بٹانا ہوگا۔ گھر کے کام کے لیے کوئی نوکر نہیں رکھ سکتے ہم۔ تمہیں سب کچھ سیکھنا ہے۔“

وہ تو آزاد تنگی تھی جسے اس کی ماں چمن کی رونق و زیبائش سمجھتی تھیں۔ ماں کے بعد وہ تنگی کے پروں کے کچے رنگ کی حقیقت بھی جان گئی۔

پھپھو جتنے دن رہیں اسے گھر دار کی سکھاتی رہیں۔ ہدایات لکھ کر رکھتی رہیں۔ کھانے پکانے کی ترکیبیں بھی سمجھاتی رہیں۔ پھپھو نے گھر کے بچے کھچے سامان کو ترتیب سے رکھوایا۔ ان کا تعاون اور امید افزا تسلیاں زندگی گزارنے میں معاون بنیں۔ بھائی نے بڑی لجاجت سے کہا۔

”گڑیا۔ میرے پاس تو تمہارے تعلیم کے لیے بھی کچھ نہیں بچا۔ تم اس سال تو کالج نہیں جاسکو گی۔ اگلے سال۔ اگلے سال پھر داخلہ لینا۔“

اور وہ چپ ہو گئی۔ حالات کے ساتھ سمجھوتا کرنا اس نے سیکھ لیا تھا۔

بھائی کو سروس ملی تو وہ گھر سنوارنے میں لگ گئی۔ ماں باپ کے پچھڑنے کا تو دونوں کو ہی غم تھا بے انتہا۔ لیکن چچی اماں کی بے وفائی بے اعتنائی نے دلوں میں زخم ڈال دیے تھے۔ وہ بے پردہ ابا بانی سی لڑکی لیکن اماں جب کہتیں۔  
 ”سسرال میں وقت سے پہلے ہی جائے گی کیا۔“ تو وہ شرما جاتی۔ کبھی اسے غصہ آتا کہ اتنی اچھی محبت کرنے والی چچی اماں کے پاس وہ صرف اس لیے نہیں جاسکتی تھی کہ وہ اس کی ہونے والی سسرال ہے۔ چچی اماں کو اس سے محبت تھی۔ اسے یقین تھا۔ اس لیے بھی کہ ان کی کوئی لڑکی نہ تھی۔ اس لیے بھی کہ اس کی اماں سے چچی اماں کی گاڑی چھنتی تھی۔ اور اس لیے کہ وہ تھی ہی اتنی پیاری کہ وہ اسے بہو بنانے پر رضامند ہو گئی تھیں۔

مگر پھر بے مہر کی گھٹائیں چھا گئیں اور بے اعتنائی کی آندھی چل پڑی۔ کسی آندھی کہ زندگی کی بچی کھچی خوشیاں بھی سمیٹ لے گئی۔ اماں گئیں محبتیں ختم ہوئیں۔ ابا اپنے ساتھ سہارے کا سا تان اکھاڑ لے گئے۔ پھر چچی اماں نے خود ہی اس کی چادر اس کے وجود سے کھینچ ڈالی اور کھلے آسمان تلے وہ ہکا بکا گرم ہواؤں کا مقابلہ کرنے کو تنہا رہ گئی۔ اب اسے کسی کا بھروسہ نہ رہا۔ بھائی کا بھی نہیں۔ پھپھو کا بھی نہیں۔ جو ابھی تو تسلی دلا سے تشفیاں اور امیدیں اور یقین کے سبز باغ دکھاتی تھیں۔ پتا نہیں کب بدل جائیں۔ وقت کے ساتھ بھلا دیں اسے۔ وہ کسی نئے زخم سے بچنے کے لیے انتظار کرتی رہی۔ یقین کے ساتھ کہ ایسا تو ہونا ہے۔

”دیکھو عمر۔ پروا کی تم بالکل فکر نہ کرو۔ اس کے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے۔ میں زندہ ہوں ابھی۔ جو کچھ کرنا ہے۔ میں کروں گی۔“

پھپھو کے دلا سے عمر کو بے یقینی کے تصور سے نکال لاتے۔ پھر بھی۔ نا تجربے کاری نے اسے خالہ بتول کے چکر میں پھنسا دیا تھا۔ خالہ بتول جو عمر کے آگے پیچھے پھرا کرتی تھیں۔ عمر کے رشتے کے لیے لوگوں کو لے کر آتیں۔ عمر نے کہا بھی کہ ابھی پھپھو زندہ ہیں۔ مگر خالہ بتول نے آنکھیں نکال کر کہا تھا۔

”رشتے داروں کا تو بھروسہ ہی نہ کروں۔ میں جو رشتہ لائی ہوں۔ وہ سب ولد و دردور کر دے گا۔ انسان کو آگے کی فکر بھی کرنی چاہیے۔ بہن کا ساتھ ہے۔ اس کے بھی ہاتھ پیلے کرنے ہیں۔ ارے یہاں سے اتنا ملے گا کہ گھر بھر جائے گا۔ حالت بدل جائے گی۔ پھر پوزیشن کے لوگ ہیں تمہاری بہن کو بھی اچھا رشتہ مل جائے گا۔“

عمر کو دولت کی تو ضرورت نہ تھی۔ البتہ بہن کے لیے سوچتا تو غصہ آ جاتا چچی اماں نے اسے فکر مند جو کر دیا تھا۔ پھپھو کی یقین دہانی کے باوجود۔ بڑے بھائی کی حیثیت سے اسے بھی تو بہن کے لیے کچھ سوچنا چاہیے۔ بس اس طرح شادی طے ہو گئی۔



پھپھو نے سنا تو رنجیدہ ہو گئیں۔ وہ تو کچھ اور ہی سوچے بیٹھی تھیں۔ ان کی بیٹی ناظمہ موجود تھی۔ جس کے لیے پروا کی اماں نے اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔ اور پھپھو کو بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ پروا کے لیے بھی انہوں نے دل میں طے کر لیا تھا لیکن عمر نے ان کے بھروسے کا بھرم نہ رکھا۔ خود ہی سب کچھ طے کر لیا تو وہ چپ کی چپ رہ گئیں۔

خیال تھا کہ بقول خالہ بتول کے۔ شادی کے بعد گھر کی حالت بدل جائے گی۔ مگر نہ گھر بھرا نہ حالت بدلی۔ خالہ بتول نے ہی ناک سے سوسوسوں کرتے ہوئے آنکھیں دبا دبا کر آنسو نکالے تھے اور رندھی آواز میں دلہن کے باپ کے کاروبار کی اچانک تباہی کی داستان سنائی۔

”ہئے ہئے۔ ایسا گھانا دشمنوں کو بھی نہ ہو۔ لاکھ کا گھر خاک ہو گیا۔ سامان تک بک گیا۔“

عمر کیا بولتا۔ اس کے ساتھ بھی ایسا کچھ ہو چکا تھا۔

بھابھی گھر میں آئی تو رونق بھی لائی۔ کوئی نہ کوئی مہمان آ جاتا۔ بھائی سسرال والوں کی تواضع میں لگ جاتے۔ بھابھی کے فترتی قمقمے سونے آنگن میں گونجنے لگے۔ شروع میں وہ بھابھی کے آگے پیچھے پھری۔ بھائی کے سوا اور تھا بھی کون اور بھائی کے حوالے سے بھابھی پیاری تھی۔ مگر جونہی اسے اندازہ ہوا کہ بھابھی کو اس کی قربت پسند نہیں۔ اس نے بھی خود کو سمیٹ لیا اور صحیح معنوں میں یکاوت بنا ہو گئی۔

بھائی کو تو اس سے مخاطب ہونے کا خیال بھی نہ آتا۔ بیوی کی دلجوئی جو خوشامد تک پہنچ جاتی۔ انہیں اسی سے فرصت نہ تھی۔ بھابھی جب مسکے چلی جاتیں تو بھائی کو بہن یاد آتی۔ گو کہ بھابھی کی موجودگی میں بھی وہی گھر سنبھالتی تھی۔ مگر ان کے جاتے ہی بھائی اسے لنبھتوں کا میٹھا شربت پلانے لگتے۔

”وہ بڑے امیر گھر کی ہے۔ ہمارے گھر میں ہے کیا۔ اس کی شرافت ہے جو خوش ہے۔ یہ تو اب ان کے حالات خراب ہوئے ہیں۔ ورنہ پہلے تو۔ ارے گھر کا سامان تک بک گیا۔“ وہ خالہ بتول اور بھابھی کی زبان ہی بولا کرتے۔

”بھائی۔ پہلے تو ہمارے حالات بھی اچھے تھے۔ جب اماں ابا تھے تو قیمتی سامان سے گھر بھرا ہوا تھا۔ ہم بھی گئے گزرے تو نہیں۔“ وہ یاد دلاتی۔

”اس سے کیا ہوتا ہے۔“ بھائی بگڑ جاتے۔ ”اب تو کچھ نہیں ہے ہمارے پاس۔“

”تو کیا ہوا۔ ہمارے ان کے حالات ایک جیسے ہی تو ہیں۔ پھر بھابھی کی امی کیوں ناک چڑھاتی ہیں اور بار بار کہتی ہیں کہ بتول نے مجبور کر دیا۔ ورنہ رشتوں کی لائن لگی تھی۔“

”اچھا اچھا چپ رہو۔ بھابھی کے سامنے نہ کہہ دینا۔“ وہ اسے ڈراتے۔

”نہیں جی۔ اتنی بے وقوف نہیں ہوں۔“

وہ خوش ہو جاتی کہ بھابھی کی غیر موجودگی میں بھائی اس سے بات تو کر لیتے ہیں اور وہ بھی دل کی بات کہہ دیتی ہے۔

”بھائی۔ اب تو سال ہو گیا۔ میں کالج میں داخلہ لے لوں۔“

بھائی حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ تو یہ بات بھول ہی گئے تھے۔ بیوی کے سوا اب تو انہیں کچھ یاد نہ رہتا تھا۔ اگلے دن ہی بھابھی کی چڑھی تیوری اور تلخ لہجے نے بتا دیا کہ اس کا شوق پورا نہیں ہو سکتا۔ بھابھی کی مرضی جو نہیں تھیں۔

”گھر میں دل نہ لگے تو کالج کا بھانا مل جاتا ہے۔ آوارگی کا دل چاہا۔ کالج چلے گئے۔ فیشن ہو گیا ہے کالج جانا۔ پڑھائی کا تو نام ہے۔ گھر سے بیزاری کا مطلب۔“

بات پوری کیے بغیر بھابھی نے اپنے خیالات کا اظہار تو کر ہی دیا۔ بعد میں بھی بڑبڑاتی رہیں۔

”ہمارے حالات ابھی ان اللہ تللوں کے قابل کہاں۔ اچھا شوق ہے بھئی۔ ہر مہینے فیس بھرو۔ کیا ڈاکہ ڈالیں۔ جیبیں کاٹیں۔ کیسے پورا کریں گے خرچا۔“

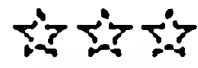
بھائی بھی منہ چھپا رہے تھے۔ وہ بھابھی کی..... مبالغہ آمیزی پر حیران بھی نہ ہوئی۔ بھائی کی آمدنی بھی اچھی خاصی تھی۔ ہر ماہ بھابھی نیا سوٹ بناتیں۔ سینڈل لیے جاتے مہینے میں دو چار دعوتیں میکے والوں کی ہوتیں۔ سسرال میں تو کئی تھا نہیں۔ بھابھی بے فکری سے خرچ کرنے والوں میں سے تھیں؛ بغیر سوچے۔

(بھائی کو کچھ بھی نظر نہ آتا) پروا چپ رہی خود اس کے پاس کپڑوں

کا اسٹاک ختم ہو گیا تھا۔ سینڈلیں ٹوٹ چکی تھیں۔ لحاف پرانا ہو گیا چادریں پھٹ گئیں۔ بھائی کو کچھ بھی نظر نہ آتا۔ آئے دن تو ان کے دوست احباب رشتے داروں میں برتھ ڈے، غقیقہ، بسم اللہ قسم کی تقریبات ہوتیں۔ ہر بار قیمتی تحائف خریدے جاتے دھوم دھام سے مٹھائی کے ڈبوں کے ہمراہ شرکت ہوتی۔ سوٹ، سینڈل اور دیگر میچنگ کے لوازمات۔ اسی کے کالج کا خرچ بچانا کیوں ضروری تھا۔ (بھائی کو کچھ بھی کیوں نظر نہ آتا۔) کیوں اور کیسے کہنے کے لیے زبان کانپ جاتی تھی۔ اب تو سب کچھ ممکن تھا۔ خاموشی اس کو اس آگئی۔

ایک دن بھائی کو خیال آ گیا۔ بولے ”یہ کیسے بدرنگ کپڑے پہنے ہیں تم نے۔ یہ اب پھینکنے والے ہو گئے ہیں۔ کل چلو میرے ساتھ۔ اپنے لیے کچھ سوٹ لے لینا۔“ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں لیکن منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ اگلے

دن تک شاید وہ یہ بات بھول گئے۔ مگر بھابھی کو یاد رہا۔ وہ اپنے دو تین پرانے سوٹ لے آئیں۔ ان کے خیال میں تو وہ ابھی 'نئے' ہی تھے۔ چمک تک باقی تھی۔ صرف ان کے دل سے اتر گئے تھے۔ پرانی پروا ابھی کبھی انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتی تھی۔ وہ ان کے تمام کپڑے ان کے کمرے میں رکھ کر آ گئی۔



صدف سے دوستی بھابھی کو اس آئی تھی۔ وہ اکیلی ذات اکثر ان کے گھر آ جاتی۔ گھنٹوں باتیں کرتیں۔ اس کی گفتگو میں تسلسل نہ تھا۔ یوں بولا کرتی جیسے کوئی مقصد نہ ہو۔ صرف وقت گزارنا ہو۔ وہ پروا پر بہت مہربان تھی۔

”اچھی بھابی خوبصورت ہو تم۔ ذرا حلیہ سجا بنا کر رکھو۔ میری طرح‘ بسمہ کی طرح۔ باقی تمام زندہ دل لڑکیوں کی طرح بھئی۔“

ایک دن اس نے تعجب سے کہا۔ ”تم پڑھتی نہیں ہو۔ اسکول کالج جانے کا شوق نہیں ہے تم کو۔ مجھے دیکھو۔ گاؤں سے آئی ہوں۔ ضد کر کے پڑھا۔ لڑکے کے پڑھا اور اب ایئر ہو سنس بھئی بن گئی۔ ضدی ہوں۔ اس لیے ہر شوق پورا کرتی ہوں۔ تم آخر پڑھتی کیوں نہیں ہو۔“

”وہ صدف باجی اصل میں۔ میں ضدی نہیں ہوں۔“

”اوہ زندہ باد۔ ویسے کبھی کبھی ضدی ہونا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اپنے لیے بھی دوسروں کے لیے بھی۔ مگر میرا دل چاہتا ہے کم از کم تعلیم کے لیے تو ضدی بن جاؤ۔“

بھابھی اس دن پروا سے خفا رہیں۔ بلکہ کئی دن ان کا موڈ خراب رہا۔ صدف کبھی کبھی ایک خوبصورت سے نوجوان کے ساتھ آتی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر چلا جاتا۔ نہ بھابھی اسے اندر بلا تیں نہ صدف ہی نے تعارف کرایا۔ پروا کو سوالات سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن وہ صدف کے خلوص کی قائل تھی۔ وہ بھابھی کے سلوک کی تلافی کرتی تھی یا تھی ہی اس قدر محبت والی۔

بھائی بھابھی کے ساتھ ان کے میکے گئے ہوئے تھے۔ وہ اکیلی تھی پھپھو آ گئیں۔ وہ حیران ہوئی مگر خوشی کو چھپا گئی۔ اب بھابھی نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جب وہ میکے جاتیں۔ بھائی کو پابند کر جاتیں۔ صبح انہیں چھوڑنے جاتے۔ دفتر سے واپسی پر سسرال سے ان کو لے کر آتے۔ اکثر تو وہیں کھانا کھا کر آتے یا ہوٹل میں ڈنر ہوتا۔ دراصل جب سے عمر کو پروا کے بدرنگ لباس کا احساس ہوا تھا۔ بھابھی نے یہ طریقہ اپنایا تھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ شاید ان کے پیچھے بہن بھائی کچھ گئے شکوے کرتے ہوں گے اور لباس کا احساس بھی عمر کو اسی وجہ سے ہوا ہوگا۔ وہ پروا سے بدظن تھیں۔

انہوں نے اسے جاننے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

رات ساڑھے گیارہ بجے کے بعد جب بھائی بھابھی ہنستے ہوئے اندر داخل ہوئے تو پھپھو نے ان کا استقبال کیا۔  
”شاباش بیٹے۔ ماشا اللہ خاصی ترقی کر لی ہے تم نے۔ آدھی رات کو گھر آتے ہو۔ باہر جا کر بھول جاتے ہو کہ تم ایک جوان بہن کو گھر میں چھوڑ آئے ہو۔ وہ ڈرپوک لڑکی جو چوہے چھپکلی سے ڈر کر چٹنیں مارا کرتی تھی۔ تن تنہا پڑی رہتی ہے۔ چاہے گھر میں ڈاکو آ جائیں یا چور۔ مگر تم کو کیا جان سے وہ جائے گی۔ تمہیں تو تمہاری خوشیاں۔“  
”پھپھو جان۔ دراصل آپ کو غلط اطلاع ملی ہے۔ میں.....“ بھابھی نے کچھ کہنا چاہا۔  
”دلہن۔ میں تم سے سوال کروں۔ تب جواب دینا۔ مجھے اپنے بھتیجے سے بات کرنے دو۔“ پھپھو جلال میں آگئیں۔

پروا جو پھپھو کے آنے خاصی مطمئن ہو گئی تھی اور بے خبر سوئی ہوئی تھی آوازیں سن کر باہر نکلی۔ پھپھو کو غصے میں بھائی کو نام اور بھابھی کو سب سے یاد کیا کر سہم گئی۔  
”کیا بات ہے پھپھو۔“

”آگ لگا کر پوچھتی ہو کیا بات ہے۔“ بھابھی گرجنے لگیں۔ ”باتیں سنو ادیں مجھے۔“  
پھپھو نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ”دلہن تم کو تہذیب سیکھنے کی ضرورت ہے۔ آدھی رات کے سنائے میں محلے بھر کو سنانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ تمہیں کسی نے یہ بھی نہیں بتایا کہ بزرگوں کے سامنے دھیمی آواز میں بولا جاتا ہے اور میں تم سے مخاطب ہی نہیں ہوں تو تمہیں بھی چپ رہنا چاہیے۔“  
”مارے مجھے جوتے۔“ بھابھی آپے سے باہر ہو کر چیخنے اور رونے لگیں۔ ”اور میرے ماں باپ کو بھی گالیاں دیتے۔“

”عمر۔ اس گھر کے آنگن نے کبھی یہ تماشا نہیں دیکھا تھا یہاں تو مردوں کو بھی نیچی آواز میں بات کرنے کی عادت تھی۔ اب تمہاری کمزوری نے یہ دن دکھایا ہے کہ گھر کی بہو کی آوازیں گلیوں میں سنی جاسکتی ہیں۔“  
”سن رہے ہیں آپ دیکھ رہے ہیں۔ کیسی میری درگت۔“ بھابھی نے کچھ کہنا چاہا۔

”تم چپ نہیں رہ سکتیں۔ جاؤ کمرے میں۔“ عمر نے آخر ڈانٹ دیا۔ پروا نے آگے بڑھ کر بھابھی سے معذرت کرنی چاہی تو وہ بھڑکنے لگیں اسے دھکا دے کر گرایا اور زور سے رونے لگیں اور پیر پختی کمرے میں چلی گئیں۔ عمر پھپھو سے صفائی دینے اور معافی مانگنے لگا۔

”بیٹا! مجھے تمہاری بیوی سے کوئی پر خاش نہیں۔ مگر اسے تہذیب آنی چاہیے۔ میں تو تم سے ہی پوچھ رہی تھی کہ کیا جوان بہن کو گھر میں آدھی رات تک تنہا چھوڑ کر جاتے ہوئے تمہیں احساس نہیں ہوتا۔ کیا یہ مناسب ہے۔ کوئی جھوٹ موٹ بھی کہہ دے کہ اس نے رات کو کسی غیر آدمی کو گھر میں گھستے دیکھا ہے تو سب سے پہلے یقین کرنے والے تم اور تمہاری بیوی ہوں گے۔ کیوں اس کے صبر کا امتحان لیتے ہو عمر! خدا کا خوف ہی کر کے یتیم بچی کا خیال کر لو۔“

عمر نادم اور شرمسار کھڑا رہا۔ پھر وہ اور پچھو دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پروا بالکل خاموش رہی۔ اگلے دن بھابھی کا موڈ اور رویہ درست ہو گیا انہوں نے پچھو سے معذرت بھی کی۔ پچھو دو دن کے لیے آئی تھیں مگر پورا ہفتہ رہیں۔ اس دن اچانک انہوں نے پوچھا۔

”بیٹی! کیا تم میری وجہ سے کالج نہیں جا رہی۔ اس طرح تو تمہارا خاصا نقصان ہوگا۔“  
 پروا کھسیا گئی، آخر اسے بتانا پڑا کہ بھائی کی اتنی آمدنی نہیں کہ اسے مزید تعلیم دلا سکیں۔ کہہ کر مزید شرمندہ ہوئی۔ پچھو کو اس کے شوقِ علم کا اندازہ تھا۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد جب وہ ان کے ہاں گئی تھی۔ پھر داخلے کی ہی وجہ سے جلدی سے آگئی تھی اور اب..... اب تک وہیں تھی۔

انہوں نے اچانک اعلان کیا کہ وہ پروا کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہیں۔ عمر نے بھی تائید کی۔ وہ تیاری کرنے لگی۔ کپڑے نکال کر چھانٹنے لگی۔ مگر کوئی کپڑا بھی اب نیا نہیں رہ گیا تھا۔ پچھو اس کے تامل اور تاسف کو دیکھ کر بولیں۔  
 ”ارے چھوڑ کپڑوں کو۔ وہاں بازار بھرے پڑے ہیں۔ میں یہ بے رنگ کپڑے لے جانے نہیں دوں گی۔“  
 پروا شرم سے زمین میں گڑ گئی۔ سر نہ اٹھایا گیا۔

جاتے ہوئے عمر نے حیرت سے پوچھا۔ ”ہائیں تمہارا سامان کہاں ہے۔“  
 ”کمرے میں پڑے ہیں وہ کپڑے دیکھ لینا۔ تمہاری عزت کے خیال سے چھوڑے جا رہی ہوں۔ بیٹا لگتا ہے کہ واقعی بھول گئے ہو کہ تمہاری ایک بہن ہے جو ضروریاتِ زندگی کے لیے تمہاری محتاج ہے۔“ پھر سرد آہ بھر کر بولیں۔  
 ”کیا زمانہ تھا۔ ماں باپ کے زمانے میں اس گھر کے نوکر بھی اس سے بہتر پہنتے تھے اور اب۔ ماں باپ کے ساتھ رشتے واسطے سب مر گئے۔“

”میں نے جو دو ہزار روپے دیے تھے اس دن۔“ عمر نے شرمندہ ہو کر کہا پھر بیوی کی طرف دیکھا وہ نظریں چرا گئیں۔

”کیا تم نے کپڑے نہیں لیے تھے۔“



پھپھو نے گھر جاتے ہی با آواز بلند سب کو سنا دیا کہ راستے میں پروا کا بکس کوئی مسافر اتار کر لے گیا، بے چاری کا سارا سامان تھا اس میں..... جوتے چیل، چوڑی، کپڑے اور چھوٹا موٹا زیور بھی۔

سب گھروالے اس 'معدوم' مسافر کو برا بھلا کہتے رہے۔ اور پروا کو تسلی دیتے رہے کہ دیکھ لینا اس بے ایمان کو وہ سامان ہضم نہ ہوگا۔ اس کے پاس سے چوری نہ ہوا تو اس کی وجہ سے اسے کسی نہ کسی مصیبت کا سامنا ضرور ہوگا اور جنید مستقل اندازے لگا تا رہا متوقع مصیبت کے بارے میں۔

”ارے چھوڑ نیچے۔ اب بس کر۔ ہماری بلا سے اسے کوئی مصیبت آئے۔ ہمیں تو اپنی بچی کی فکر ہے۔“ پھپھو نے جنید کو روکا۔ پروا کو ہنسی آرہی تھی۔ پھپھو کا بہانہ بے حد کمزور تھا لیکن کام آگیا۔

”پروا آؤ۔ کھانا کھاؤ۔“ تنویر بھا بھی نے پکارا۔

”بھابھی جان شاعرہ ہو گئی ہیں۔“ عبید نے کہا۔

”پچھوانہ آنا۔ کہیں گرمی نہ ہو جائے۔ دونوں کے لکراؤ سے خدا جانے کیا ہو۔“ جنید نے شریر لہجے میں کہا۔

پچھوانا ان کی ملازمت تھی۔ ہر وقت ککھی ککھی کرتی رہتی۔

”پروا۔ پچھوا۔ امی جان۔ کہیں ان کی ایک جگہ موجودگی سے ستاروں کی چال نہ بدل جائے۔ پتا نہیں زمین پر

اس کے کیا اثرات ہوں۔ کہیں جنگ نہ ہو جائے۔“

جنید سوچتے ہوئے بولا۔ بڑا سنجیدہ لگ رہا تھا۔

تنویر بھا بھی نے پروا کو کپڑے دے کر کہا۔

”فناٹ کاٹ لو۔ پھر میں شلوار اور تم قمیص ہی لینا۔ کل پھر اور کپڑے بازار جا کر لے آئیں گے۔ تم اپنی پسند

سے لے لینا۔“

پروا کو ندامت ہو رہی تھی۔ پھپھو نے اسے اپنے گھرا کر کس امتحان میں ڈال دیا تھا۔ تنویر نے جو کہا تھا۔ وہی

کر کے دکھایا۔

اگلے دن ہی اس کی پسند سے کپڑے چیل وغیرہ خریدوائے۔ کئی دن تک دونوں سلائی میں مصروف رہیں۔

جب تک اس کی ہر ضرورت کی چیز مہیا نہ ہو گئی۔ تنویر بھا بھی کو چین نہ آیا۔ وہ بڑی بہن کی طرح اس کا ذمے داری سے

خیال رکھتی تھیں اور اتنی بے تکلفی سے کہ کسی غیریت کا احساس نہ ہوتا۔ ہر وقت ہنسی مذاق میں مصروف کام بھی کر رہی

ہیں۔ جنید عبید سے مذاق ہو رہا ہے اور پروا کے ساتھ مل کر انہیں تنگ بھی کر لیتی تھیں۔ واقعی تنویر بھا بھی خدا کا انعام

تھیں اس گھر کے لیے۔ شاید پھپھو کی نیکیوں کا صلہ۔ عبید نے اسے فارم لا کر دیے۔

”چلیے جی اسے فل کیجیے۔“

”کیا۔ کیا یہ۔“ وہ کچھ بھونچکا سی ہو گئی۔ دیکھ رہی تھی کالج داخلے کے فارم ہیں۔

”بس۔ کچھ ہے۔ آپ کو اگلے ہفتے سے کالج جوائن کرنا ہے۔ آیا کھوپڑی میں۔“

”مگر۔ میں نے بھائی سے اجازت تو لی نہیں ہے۔“ وہ ڈری کہ بھائی کہیں برا نہ منائیں۔

”تم پڑھنا چاہتی ہو یا نہیں۔“

”چاہتی ہوں مگر۔ بھائی کی مرضی کے خلاف نہیں۔“

داخلہ فارم اس کے ہاتھ میں لرز نے لگا۔ بمشکل آنسو روک رہی تھی۔ کیسی کیسی خواہشیں کہاں کہاں پوری ہوتی ہیں۔

”ڈرو نہیں پروا۔“ پھپھو نے اسے لپٹا لیا۔ محبت سے مخاطب ہوئیں۔

”میں نے عمر سے کہہ دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ اس کی تعلیم کا خرچ تم کو ہی ادا کرنا ہے کیونکہ یہ تمہاری ذمہ داری

ہے۔ عمر نے اقرار کیا تھا وہ بہت شرمندہ تھا۔“

”امی جان! آپ نے خوب لتے لیے ہوں گے عمر بھائی کے۔“

عبید نے کہا پھر مڑ کر بھابھی سے پوچھا۔

”میں نے لتے لیے صحیح جگہ استعمال کیا ہے نا۔ کہیں اس سے مراد کپڑے چھیننا تو نہیں لتے کپڑوں کو کہتے ہیں نا۔“

عبید کو محاورے استعمال کرنے کا شوق تھا۔ اکثر وہ غلط بول دیتا تھا پھر سب مذاق اڑاتے۔

”لتے لینا۔ اگر کپڑوں کو کہتے ہیں۔ تو وہ تو میں نے لیے ہیں۔“ پروا نے کہا۔

پروا خوش تھی۔ گھر میں محبت اور خلوص کی فضا تھی۔ کوئی تکلف نہ تھا۔ پھر پھپھو کی شفقتوں کا۔ سائبان اس پر سایہ

فلن تھا۔ پھوپھا جان بھی اس کو بہت چاہتے اور خیال کرتے تھے۔

☆☆☆

قصبہ ترقی پذیر تھا۔ ماحول میں سادگی تھی۔ دیہاتی رسم و رواج تھے۔ کالج میں لڑکیاں سادہ لباس میں ہوتیں

لیکن ان پر دیہاتیت کی چھاپ نہ تھی۔ تعلیم عام ہو رہی تھی۔ شہر سے آنے والے اپنے ساتھ جو فیشن لاتے۔ وہ فوراً

مقبول ہو جاتا۔ اس کی کئی لڑکیوں سے دوستی ہو گئی۔ گھر میں بھابھی سے دوستی تھی۔

ناظمہ بڑی بہن کے پاس گئی ہوئی تھی۔ وہاں سے آئی تو پروا کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ دونوں ساتھ کالج جاتی



تھیں۔ اکثر جنید انہیں چھوڑ کر آتا۔ واپسی میں کئی لڑکیاں ساتھ ہوتیں۔ گپ شپ کرتے ہوئے پیدل ہی آ جاتی تھیں۔ وہ جو اپنے گھر تہی داماں آئی تھی۔ خالی ہاتھ۔ غموں کا بوجھ لیے۔ اب اس کے پاس بہترین لباس بھی تھے اور ہر رنگ ڈیزائن کے سینڈل چپلیں، دیگر ضروریات بھی۔ اگر دنیا میں دولت و شکوک کا معیار یہی ہے کہ اس کے پاس ہر چیز موجود ہو۔ ہر خواہش پوری ہوتی ہو۔ تو بلاشبہ اس کا شمار دولت مندوں میں ہوتا۔ ضروریات زندگی، تعیشات زندگی بھی اور محبتیں بھی۔ چاہتیں بھی۔ کیا نہ تھا اس کے پاس۔

احساس کتری کا شکار، دکھی دل اور زخمی جذبے کے ساتھ جب وہ پھپھو کے ساتھ آئی تھی۔ تو اس کی گردن اور آنکھیں جھکی ہی رہتی تھیں۔ مگر اب وہ سر اٹھا کر چلنا سیکھ گئی تھی۔ خود اعتمادی اور پھپھو کے گھر والوں پر یقین نے اسے افضل دنیا یاں کر دیا تھا۔ کالج میں وہ ہر جگہ مقبول تھی۔ مباحثے ہوں یا ڈرامے، گیمز ہوں یا تقریری مقابلے۔ گھر میں بھابھی اس سے مشورے لیتیں۔ ناظمہ پر اس کا بڑا رعب تھا۔ صرف جنید! عبید اس پر رعب جمانے سے نہ چوکتے۔ وہ اب پرانے زمانے کی پروا تو نہ تھی۔ مگر ہاں۔ اب بھی کبھی کبھی مزے میں آتی تو کھل کر ہنستی۔

اب اماں ابا تو تھے نہیں۔ جو اس کے ناز اٹھاتے۔ مگر پھپھو مزاج داں تھیں۔ باقی سب بھی قدر دان تھے۔ اب ہنسی کی بات پر ہنستی تھی اور کوئی بات بری لگے تو منہ پھلا کر بیٹھ جاتی۔

”سنا ہے، کوئی لقا کبوتری اڑ کر ادھر آئی ہے۔“ جنید کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا۔ وہ منہ پھیر لیتی۔

”بھیا! آج تو گر لڑ کالج سے چیخوں کی آوازیں آرہی تھیں۔“

”ہیں۔ کیسی چیخیں بھئی۔“ بھابھی گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتیں۔

”شہر میں تو یہ افواہ اڑ رہی ہے کہ آج پرنسپل نے لڑکیوں کی خوب پٹائی کی ہے اور کئی لڑکیوں کے تو مارے

تھپڑوں کے منہ سجا دیے ہیں۔ بے چاری۔“ عبید تو اس کی طرف کن اکھیوں سے بھی نہ دیکھتا۔ وہ تلملا کر پھپھو کی طرف دوڑتی۔ پیرنچ کر کہتی۔

”منع کر لیں پھپھو، عبید بھائی کو۔“

”امی جان۔ میں نے کیا کیا ہے۔ شہر میں افواہ تھی۔ گھر آ کر دیکھا تو واقعی۔“

”پھپھو! وہ رو ہانسی ہو جاتی۔“

”اچھا تو پھر منہ کیسے سو جاتہارا۔ ہم افواہوں کا یقین نہیں کرتے۔ آنکھوں دیکھی پر بھروسہ کرتے ہیں البتہ۔“

بھابھی میں نے صحیح کہا ہے نا۔ البتہ غلط جگہ تو نہیں۔“

”کبھی کبھی آنکھیں بھی دھوکا کھا جاتی ہیں۔“ وہ بڑی غفلندی سے کہتی۔

☆ ☆ ☆

وقت دھیمی چال سے چل رہا تھا۔ وہ شوق سے تعلیمی مدارج طے کر رہی تھی۔ کبھی کبھی عمر کا خطا آ جاتا۔ اس نے چھٹیوں میں آ کر مل جانے کا وعدہ کیا تھا اور اسے آنے سے منع کر دیا تھا۔ پھر اس دھیمی چال کے دریا نے اپنا دھارا بدلا۔ پھپھو کے بڑے بیٹے سعودی عرب سے آئے، گھر میں رونق ہو گئی۔ ہنگامے جاگ گئے۔ بھابھی ہنس مکھ تو تھیں مگر زوہیب کے آنے سے ان کے لبوں پر ہر لمحہ ایک دلکش مسکراہٹ پھول کھلانے لگی۔ وہ مزید خوش مزاج ہو گئیں۔ زوہیب اپنی بہنوں کی طرح پروا کے لیے بھی کئی تحائف لے کر آئے تھے اور انہوں نے پروا کے اپنے گھر رہنے پر خوشی کا اظہار بھی کیا۔

عمر دوبار آ کر بہن سے مل کر گیا۔ پھر زوہیب سے ملنے بھی آیا۔ پروا کو خوش دیکھ کر عمر کو بہت اطمینان تھا۔ ناظمہ کا ایک اچھا رشتہ آیا ہوا تھا۔ پھپھو چاہتی تھیں زوہیب کی موجودگی میں ہی ناظمہ کی شادی ہو جائے۔ اس کی سسرال والے بھی جلدی کر رہے تھے۔ چنانچہ تاریخ طے ہو گئی۔ یک لخت گھر میں افراتفری اور شور ہنگامہ شروع ہو گیا۔ ناظمہ اور اسماء اپنی سسرال سے آگئیں۔ بچوں کا شور الگ تھا۔ اور اس دن تو مسرت عروج پر پہنچ گئی جب امریکہ سے پھپھو کا منجھلا بیٹا جنیب آ گیا۔ تہمتوں اور لطیفوں کا نہ ملنے والا سلسلہ۔ جنید عبید کیا کم تھے کہ جنیب بھی ان کی ٹولی میں شامل ہو گئے۔ پھپھو خلاف معمول بے حد مسرور تھیں اور کھلی پڑ رہی تھیں۔ بہنیں الگ خوشی کے اظہار میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں تھیں گھر کا بیڑا تھا۔ مگر لوگ بھی بہت تھے۔ خاصا شور تھا۔ جنیب نے کئی بار کہا۔

”یہ اتنے بہت سے لوگ کہاں سے آ گئے۔“ وہ کئی سال بعد آیا تھا کئی بچے تو اس نے دیکھے نہ تھے۔

”بھئی اب تو رات ہو گئی ہے۔ سب اپنے اپنے گھر کو جائیں۔“ آخر کار رات کو اس نے دو ٹوک بات کی۔

”ہائیں۔ یہاں غیر کون ہے جو اپنے گھر جائے۔“

”امی! رات کو تو چڑیاں بھی اپنے اپنے گھونسلوں میں بسیرا لیتی ہیں مگر انسان کے شوق کا تو۔ اب اگر کوئی

پرائیوٹ بات کرنا چاہے۔ تو سب کے سامنے کیسے کرے۔“

پھپھو ہنس دیں۔ ”لو سب گھر والے ہی تو ہیں کیسے کہہ رہے ہو تم۔“

”مجھے تو نئے نئے چہرے نظر آ رہے ہیں۔ آخر گھر والوں کو آرام کا موقع تو ملنا چاہیے۔ شادی کا یہ مطلب تو

نہیں کہ دوسروں کو بے آرام کیا جائے۔“

جنیب کی نظریں واضح طور پر پروا کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ وہ سناٹے میں آ گئی۔ گویا اس کا مخاطب وہ تھی۔ واقعی ان بہن بھائیوں کے درمیان وہ غیر نہ سہی۔ مگر اجنبی تو تھی۔ ان سے دور رشتے دار، بس رشتے دار اے اپنی تو ہیں کا احساس ہوا اور جیسے اتنے دن میں پہلی بار تنہائی کا خوف بھی۔ وہ غیر محسوس طریقے پر کانپی۔ حالانکہ اتنی گرمی نہ تھی کہ وہ سردی کا تصور کر کے کپکپاتی۔ وہ اٹھنے لگی تو ناظمہ نے پکڑ لیا۔

”کہاں جا رہی ہو۔ بیٹھو نا۔ اتنا تو مزا آ رہا ہے۔“

ناظمہ کو واقعی مزا آ رہا تھا۔ وہ پروا کی بے لطفی کا احساس نہ کر سکی۔

”بس اب میں جاتی ہوں۔“ اس نے چپکے سے کہا۔

”کہیں نہیں جاؤ گی تم۔ بس بیٹھی رہو۔“ وہ پیار سے ڈانٹ کر بولی۔

جنیب کی نگاہوں کی غیریت اور بیزاری کی کیفیت ناظمہ جان نہ سکی اور وہ جو جان گئی تھی۔ انہیں پرائیوٹ بات کرنے کا موقع دینے کے لیے ناظمہ کا ہاتھ جھٹک کر باہر آ گئی۔ ناظمہ حیران رہ گئی۔ وہ باہر نکلتی رہی تھی اور عبید بڑی سی ڈش میں کٹے ہوئے خربوزے لیے چلا آ رہا تھا۔

”بیٹھے خربوزے۔ آ جائیں مہربان۔ قد روان۔“

اس نے لبک کر پروا کو مخاطب کیا لیکن وہ دل نہیں چاہ رہا، کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ یہ چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں فالتو سامان پڑا رہتا تھا۔ اب اس کے کہنے پر پھپھو نے اس کے لیے خالی کمرہ صاف کروایا تھا۔ تاکہ وہ اکیلے میں دل جیتی سے پڑھ سکے۔ جب سے گھر میں مہمانداری ہوئی تھی۔ وہ رات کو یہیں سو جاتی تھی۔ پہلے پھپھو کے کمرے میں اس کا پلنگ ہوتا تھا۔ آج کل وہاں اسما اور ان کی بیٹی رہتی تھی۔

آج کی رات رتجگا لے کر آئی تھی۔ جنیب کی آمد کی خوشی میں ان کے بہن بھائی جاگ رہے تھے۔ وہاں خوشیوں کی بارات اتری ہوئی تھی۔ تہتہوں کی جھنجھناہٹ تھی۔ اور اس چھوٹے سے کمرے میں اس کے آنسوؤں سے چراغاں ہو رہا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جنیب نے اسے پہچانا نہ ہو اور یہ بھی ممکن نہیں کہ پہچاننے کے بعد بیزاری کا اعلان کریں۔ اور اگر یہی ہوا ہے تو پھر۔ جنیب کی فطرت میں کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ پھپھو کی کوئی اولاد اس قدر بے مہر نہیں۔ بالکل اجنبی اور غیروں سے بھی وہ یہ سلوک نہیں کرتے۔

پہلی بار اپنی ذات قطعاً غیر اہم لگی۔ اجنبی اس گھر کے لیے غیر ضروری فضول۔ خود پر رحم کھانے کی اس کی عادت

نہ تھی۔ لیکن اپنے وجود پر افسوس ضرور ہوا۔

حسب معمول وہ صبح سویرے اٹھی۔ نماز پڑھ کر کچن میں گئی۔ جہاں پچھوا کی ماں اس کے لیے ناشتہ بنا رہی تھی۔ وہ اپنے لیے چائے بنانے لگی۔ یہ روز کا معمول تھا۔ پچھوا کی ماں اس کے سامنے ناشتہ رکھ کر پچھوا کو جگانے چلی گئی۔ رات کی انسائی کے مقابلے میں صبح روشن اور خوشگوار تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا اور پرندوں کی نغمہیں چہچہاہٹ۔ فضا میں مویے کے پھول مہک رہے تھے۔ ابھی اس نے چائے میں چمچہ چلا کر نیچے رکھا تھا کہ قریب سے جنب کی آواز سن کر چونک گئی۔ وہ کسی کو جواب دے رہا تھا۔

”ارے بوا۔ ہم ٹمبیرے مزدور۔ چاہے جب سوئیں سویرے جاگنا ضروری۔ آخر کام پر جانا ہوتا ہے۔ خود ہی ناشتا بنا کر زہر مار کر ناپڑتا ہے۔ پھر۔ تین بسیں بدل کر.....“

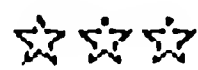
بالوں سے پانی ٹپکتا تو لیے سے سر رگڑتا وہ اندر آتے آتے دروازے میں ہی ٹھٹک گیا۔ فقرہ ادھورا چھوڑ کر اسے بغور دیکھتے ہوئے پھر اندر آیا۔

”ہائیں۔“ وہ انگلی اس کی طرف اٹھا کر بولا۔

”تم۔ تم ہو۔ تمہیں نیند نہیں آئی۔ شادی ناظمہ کی ہو رہی ہے اور رتجگا تم کر رہی ہو۔ کیا تمہیں کوئی کام نہیں۔ کہ صبح سویرے اٹھ کر آگئیں۔ یا گھر میں کھانے کو نہیں ملتا۔“

وہ تو اپنی رو میں بولتا جا رہا تھا اور وہ شرم سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ چائے کی بھری پیالی مہکتا پر اٹھا۔ وہیں چھوڑ کر وہ دوڑتی ہوئی باہر نکلی اور کمرے میں گھس کر رونے لگی۔ ایسی ذلت تو کبھی کسی نے نہیں کی تھی۔ یہ اتنا بے مروت۔ نہیں بے مروت نہیں سنگدل انسان ہے۔ اسے دوسروں کے جذبات کا ذرا سا احساس نہیں۔

پ سارے عین میں پھیل گئی تھی مگر یہ روشنی چبھتی ہوئی سی تھی۔ جیسے اس کو گھور رہی ہو۔ ہیں۔ تمہیں اپنے گھر میں کھانے کو نہیں ملتا۔ جنید عبید تو صبح چار بجے تک جاگے تھے۔ اب بے خبر پڑے سو رہے تھے۔ وہ پچھوا کی ماں کو لے کر کالج چلی گئی۔



جنید تو اس کی بات سن کر ہن دق رہ گیا۔ حیرت کی زیادتی سے اس کا منہ بھی کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کتنی عجیب بات سنی تھی اس نے۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ پروا جھینپ گئی۔

”بس۔ اب دل نہیں لگتا۔ پڑھائی کا کیا ہے۔ وہاں بھی پرائیوٹ امتحان دے سکتی ہوں۔“ منہنا کر رہ گئی۔

”پوچھ سکتا ہوں کہ یہ اچانک تمہیں کیا سوچھی۔“

”نہیں تو۔ اچانک تو نہیں۔“ وہ ہنسی میں نالے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”کافی دن سے سوچ رہی تھی۔“

”اور اس کے اعلان کے لیے تم نے ناظمہ کی شادی کا زمانہ منتخب کیا۔ سب کی خوشیوں پر اس پڑ جانے تمہاری بلا سے۔“ جنید کی حیرت اب تاسف اور مایوسی میں بدل گئی۔

”اوہو۔ بھئی کچھ نہیں ہوتا۔ اور ابھی فوراً تو میں نہیں جا رہی۔ بھائی آئیں گے ناشادی میں۔ ان کے ساتھ۔“ جنید نے منہ بنا کر سر ہلایا۔ سر کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ ابھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر گردن ہلاتا ناظمہ کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ جہاں آج کل سب کا جھگھٹار ہوتا تھا۔ جنیب کئی دن سے لاہور گیا ہوا تھا۔ اس لیے کچھ ہنگامہ کم تھا۔ اور پروا بھی سب کے ساتھ سلائی کروالیتی تھی رات کو عید نے قدرے جھلاہٹ کے انداز میں کہا۔

”امی جی۔ آپ نے اپنی بھتیجی کی عقل مندی ملاحظہ کی۔ یاسی۔“

پھر ماں کو متوجہ پا کر انگلی اٹھا کر ناگواری سے بولا۔

”صبح کو ناشتہ کیے بغیر جاتی ہیں محترمہ۔ کالج سے آ کر بھی کچھ نہیں کھاتیں۔ رات کو سب کے اصرار پر ذرا سا

چکھ لیتی ہیں۔ مرن برت تو یہ ہوگا نہیں۔ پوچھیے۔ پوچھیے۔“

پھپھو ماتھے پر ہاتھ مار کر اس کے قریب آئیں۔

”ارے۔ میں کجخت اتنی بے خبر ہو گئی۔ اور کسی نے بتایا تک نہیں کہ میری بچی بھوکے کالج جاتی ہے۔ یہ بوا اور

پچھوا کی ماں آخر کس مرض کی دوا ہیں۔ ناشتا بنا کر نہیں دے سکتیں اسے۔“

”کھانا۔ ناشتا۔ یہ تو ان کی قوت برداشت کا معاملہ ہے۔ مگر امی اب تو یہ یہاں سے بیزار ہو گئی ہیں۔ جانا

چاہتی ہیں اپنے بھائی کے پاس۔“ جنید کا آزر دہا جب اس کے دکھ کا غماز تھا۔

”پروا۔ پروا یہ کیا۔ ہائیں۔“

بھابھی، ناظمہ اس کی طرف بڑھیں اور اس سے اس کی وجہ پوچھنے لگیں۔ وہ پشیمان سی بیٹھی تھی۔ تو بہ کیسے موقع پر اس نے اظہار کی حماقت کی تھی۔

”میں ادھر وہندوں میں گرفتار۔ ہر شخص میری بوئیاں نوچنے آ جاتا ہے۔ اوسان ہی نہیں کہہ دیکھتی کیا کھا رہی ہو

کیا نہیں۔ اور یہ جانے کی کیا تک ہے۔ جنید نے ایسے ہی اڑائی ہے۔“

وہ گردن نیچی کیے دوپٹے پر نیل ٹانگتی رہی۔

”ہوں۔ کسی نے کچھ کہہ دیا ہے۔“ بھابھی معاملے کی تہہ تک پہنچ گئیں۔

”معاف کر دو نا۔ پروا پلیز۔“ ناظمہ اس سے لپٹ گئی (۔ آویہ چاہتیں ) نہیں جاؤ گی نا۔“ وہ پر امید نظروں سے پروا کو دیکھنے لگی۔

”اور ابھی تو بی اے کیسز نہیں ہوا۔ محترمہ نہ ادھر نہ ادھر۔ معلق ہیں ہوا میں۔“

”اور ویسے ہمیں کوئی حق بھی نہیں کہ تمہیں روکیں۔“ جنید اور عبید دونوں بے حد خفا تھے۔

وہ ہنسنے کی کوشش کر رہی تھی اور آنکھیں بھیگی جا رہی تھیں۔ ”خواجواہ جنید بھائی نے بات کا ہتکڑ بنا دیا میں نے تو۔ بس ایسے ہی۔“

”اچھا۔ ایسے ہی۔ ذرا آنسو تو پونچھو۔“ جنید پتھر خنگی سے بولا۔

اف۔ یہ وقت بے وقت بھرا آنے والے آنسو۔ دوپٹے سے منہ رگڑنے لگی۔

”ہاں جی۔ ہم ہوتے کون ہیں۔ خواجواہ۔ ہر شخص اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے۔“

”یہاں کیا ہو رہا ہے۔ کانفرنس۔ جس طرح میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اسی طرح۔ ہائیں مگر سب منہ پھلائے کیوں بیٹھے ہیں۔“

جنیب بولتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ پروانے سائیڈ کے دروازے سے کھسکنے میں عافیت جانی کہ اب اس کی ذات کی تحقیر کرنے والا آ گیا تھا۔

”کچھ نہیں۔ ہاں تم کہو۔ سب سے مل کر آئے ہونا۔ عمر سے ملے۔“

”اوو۔“ سر پر ہاتھ رکھ کر جنیب دانتوں میں زبان دبا کر شرمندہ ہو گیا۔ ”بھول گیا۔“

”یہ تم لوگوں کی یادداشت۔ اچھا وہ شادی میں آئے گا۔ اس کی بیوی بھی ہوگی۔ اسے کوئی تحفہ ضرور دینا۔ آخر کو بہو ہے۔“

”بھائی جان! میری سب چیزیں لے آئے۔ بانو بازار سے وہ آرٹی فیشل جوڑا۔ ڈارک براؤن۔“ ناظمہ جنیب کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”امی! آپ پوچھیں تو سہی۔ آخر ایسی کیا بات ہوئی کہ اچانک ہی دل گھبرا گیا اور جانے کا ارادہ کر لیا۔“ جنید کچھ الجھ کر پتھر ماں سے مخاطب ہوا۔

”اور ابھی تو انگیزیم بھی نہیں ہوئے۔ کیا یہ سال ضائع ہوگا۔ پھر تو بڑھا پے تک ایم اے کر سکیں گی محترمہ!“ عبید

بھی بے چین تھا۔ ”آخر اس تلون مزاجی کی کوئی وجہ تو ہوگی۔

”بس کسی نے کچھ کہہ دیا ہے۔ میں سمجھ گئی ہوں۔ وہ بتائے گی نہیں۔“ بھابھی نے سر ہلایا۔

”یہ کس کا ذکر ہے۔“ جنیب بیگ سے ناظمہ کی چیزیں نکال رہا تھا چونک گیا۔

”پروا کا۔ ایک دم جانے کا پروگرام بنالیا۔ میں تو حیران ہوں اور پھر کئی دن سے نہ کچھ کھاتی پیتی ہے۔ نہ ہنستی

بولتی ہے۔ کیوں امی۔“

”ہاں۔ رنجیدہ تو ہے۔ ادھر کئی دن سے ڈھونگی کے پروگرام سے بھی الگ تھلگ رہتی ہے۔ سردرد کا بہانا

کر کے۔“

”یہ کون محترمہ ہیں جن کا اس شد و مد سے ذکر ہو رہا ہے۔“ جنیب کی حیرانی دور ہی نہیں ہوئی۔

”پروا کا۔ کہاں گئی۔ ابھی یہیں تو تھی۔“ چھپو نے گردن گھما کر دیکھا۔

وہ اپنا بستر جھاڑ رہی تھی۔ کمرہ صاف کر کے کتابیں جمادی تھیں۔ چادر جھاڑ کر بچھا رہی تھی تب جنید آیا۔

”چلیے محترمہ۔ امی کے پاس پیشانی ہے آپ کی۔“

”کیا ہے۔“ وہ کھسیا کر ہنسی۔

”پیشانی۔ بنام بھائی جان مقدمہ دفعہ فلاں فلاں۔ مگر ابھی تو نقاب کشائی ہوئی ہے۔“

وہ یک لخت سنجیدہ ہو گئی۔ منہ پھیر کر بیٹھ گئی اور چادر کے دھاگے نوچنے لگی۔ جنید سمجھ گیا، جنیب سے خفا ہے۔

”دیکھو پروا۔ بھائی جان پر دیکھی ہیں۔ برسوں کے بعد آئے ہیں اور تمہیں تو مدت ہوئی جب دیکھا تھا۔ اب

ان کے انجان بچے پر سزا دو گی۔ وہاں کی تہذیب کے مطابق تو ان کا رویہ۔ پتا نہیں تم نے کیا دیکھا اور محسوس کیا۔ میں

واقف نہیں ہوں۔ لیکن کیا معافی سے کام نہیں چلے گا۔“ اس کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

”اصل میں۔ سخت نیند آ رہی ہے تم جاؤ تو میں لیٹوں۔“

”میری موجودگی میں لیٹنے پر پابندی تو نہیں۔ کم از کم میں نے نہیں لگائی۔ تم خود ہی خول میں بند ہونا چاہو تو کیا

کر سکتے ہیں۔“ اس نے دانت چمکائے۔ ”ویسے بات ٹالنے میں استاد ہو۔ پھر کیا کہوں۔“

”میں سمجھی نہیں۔ کیا کہوں سے کیا مراد ہے۔“ اس نے پیراٹھا کر پلنگ پر رکھ لیے۔

”میرا خیال ہے کہ بھائی جان کوئی بڑی بری سی بات تو نہیں کہہ سکتے۔ دل آزاری والی بات وہ نہیں کرتے۔

بس ذرا کھرے آدمی ہیں۔“

”پتا نہیں کیا کہہ رہے ہو۔ بھئی جاؤ میں سو رہی ہوں۔“ منہ پر دوپٹا ڈال کر وہ لیٹ ہی گئی۔

صبح سویرے کالج جانے کے لیے برآمدے سے اتری تو کار اسٹارٹ تھی۔ جنیب نے ہاتھ بڑھا کر بہ آسانی اسے پکڑ لیا۔

”آئیے۔ تشریف لائیے۔ غلام حاضر ہے۔“ پروانے ہاتھ جھٹکا۔

”میں کالج کا راستہ جانتا ہوں اور ہوں بھی شریف۔ پردیس جانے کا یہ مطلب تو نہیں کہ بندہ اپنی گلی یا اپنے شہر کے راستے بھلا دے۔ جناب ہم آپ کو بحفاظت پہنچا دیں گے۔“

وہ ہاتھ چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ پروانے کے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ آخر کار کوئی اور چارہ نہ دیکھ کر وہ سر جھٹکا کر سیٹ پر دبک گئی۔ وہ اسے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا اور بڑا اتار ہا۔

”کمال ہے۔ پتا ہی نہ تھا اور کسی نے بتایا بھی نہیں اور یہ ایسی بات نہ تھی کہ سمجھ میں نہ آئے۔ پھر میں کیوں نہ سمجھا۔ غلطی تو مجھ سے ہوئی۔ سزا تمہیں کیوں۔ مجھے ملنی چاہیے نا۔ ہیں نا۔“ وہ سر جھٹکائے فائل دانتوں سے کترتی رہی۔

”یہ کالج اتنے قریب کیوں ہے۔ کتنا چھوٹا راستہ ہے اسے کچھ فاصلے پر ہونا چاہیے۔ یہ کیا کہ سوال ختم ہوں۔ جواب سے پہلے کالج آ جائے۔“

وہ بڑے شیریں لہجے میں بول رہا تھا (تلافی) کار رکتے ہی وہ چھلانگ لگا کر اتری اور بھاگ کر گیٹ میں گھس گئی۔ جیسے کوئی بلا اس کا پیچھا کر رہی ہو۔ کتنی دیر تو سانس درست کرنے میں لگی۔ واپسی میں گھر آتے ہوئے بھی خوف سا سوار رہا۔ کچھ پشیمانی تھی۔ کچھ ندامت۔ صورتحال مزید الجھ رہی تھی۔ وہ چپکے سے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ سہ پہر کو بھابھی نے آ کر جگایا۔ ناظمہ کے کمرے میں سب جمع تھے۔ سوائے جنیب کے۔ وہ چپکے سے جا کر بیٹھ گئی۔ چائے ہو رہی تھی مگر سب خاموش تھے۔ جیسے کوئی حادثہ ہوا ہو۔ یا کوئی خبر۔

”بھائی جان واپس جا رہے ہیں۔“ ناظمہ پیٹ کی ہلکی تھی۔ زیادہ دیر کوئی راز نہیں رکھ سکتی تھی۔

پیالی پروانے کے ہونٹوں سے لگی۔ گرم چائے چھٹک گئی۔ ہونٹ جل گئے۔ وہ بخور چائے کو دیکھنے لگی۔ بھاپ اڑاتی چائے۔ سینہ بھی جلا سکتی ہے۔ پھر کیوں پیتے ہیں۔

”کہتے ہیں کہ انہوں نے دل آزاری کا گناہ کیا ہے اور سزا بھی انہیں ہی ملنی چاہیے تھی۔ نہ کہ۔ اور کہتے ہیں کہ وہ گئے تو پتا نہیں اور کتنوں کے دل دکھیں گے ان کی باتوں سے۔ اماں خوشامد کر کر کے تھک گئی ہیں کہ بھیا شادی کے بعد چلے جانا۔“



ناظمہ سرگوشی کر رہی تھی۔ اس کے کانوں میں نکلیاں ہی بھنبھنارہی تھیں۔

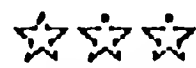
”اور انہیں بہت دکھ ہے کہ تم نے ان سے بات تک نہ کی۔ انہیں اپنی توہین کا احساس ہے اور کہتے ہیں کہ وہ خود کو معاف نہیں کریں گے۔ تم نے ان سے بات کیوں نہ کی۔ بڑا صدمہ ہے انہیں۔ دو مہینے کے لیے آئے تھے اب۔ اللہ جی۔ اتنا افسوس ہے سب کو۔ کسی کی مانتے بھی نہیں۔“

بوکھلا گئی پروا۔ خاصی دشمنی دکھا رہا تھا یہ شخص۔ اس کا کوئی قصور نہ تھا مگر سب کی نظریں اسی پر تکی ہوئی تھیں۔ جنید یوں منہ بنا رہا تھا جیسے کڑوی گولی چبائی ہو۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ہنستی۔ مگر یہاں تو سب ہی کڑوی گولی چبائے بیٹھے تھے۔

”اماں رو رو کر بے حال۔ رنگ میں بھنگ ہو گیا۔ اپنے کمرے میں سر باندھے پڑی ہیں۔ سارا کام یونہی پڑا ہے۔ بالنگ ادا اس۔“ ناظمہ بسور رہی تھی۔

”شادی تک تو رک جاتے۔ مجھے کتنی خوشی تھی کہ بھائی جان آگئے ہیں۔ پیکنگ کرنے لگے ہیں۔“

صبح سے گزر کر جب وہ اس کے کمرے کی طرف بڑھی تو اسٹور میں پھپھو کھڑی چاول تلواریں تھیں۔ پھپھو کے ہاتھ میں ترازو تھی اور وہ کھی کھی کھی ہنسنے جا رہی تھی۔ پھپھو بھی ہنسی روک رہی تھیں۔ پھپھو پچا جان مزدوروں سے فرش درست کر رہے تھے۔ کچھ سوچنے کی مہلت نہ تھی۔ کمرے کا دروازہ پکڑے وہ کچھ حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ ابھی اندر جانے کا فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ دروازہ دھڑاک سے کھل گیا۔ وہ سامنے لیٹے جنیب کو دیکھتی رہی جس کے کان میں ایئر فون لگا ہوا تھا اور ریڈیو سے موسیقی کی لہریں براہ راست اس کی سماعت کو غذا پہنچا رہی تھیں۔ اس کا سوٹ کیس بھی یونہی کھلا پڑا تھا۔ خالی الماری بند تھی۔ کمرے میں پیکنگ کے آثار نہ تھے۔ پھپھو کے ہاں کے سب دروازے بھی اس قدر آواز پیدا کرتے تھے۔ تو بے کیا تھا اگر وہ بے آواز ہوتے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر چپ چاپ لوٹ جاتی۔ ناظمہ نے کس قدر غلط بیانی کی تھی۔ سب لوگ جو کڑوی گولیاں چبائے بیٹھے تھے۔ ان کی اداکاری۔ مگر پھر اس کا تماشا کیسے بنتا۔



”آئیے۔ مجھے منانے آئی ہیں آپ۔“ ہنس رہا تھا۔ بے شرم۔

”جی نہیں۔ آپ کی پیکنگ کاراز جاننے آئی ہوں۔“

”ہائے اس زود پشیمان کا پشیمان ہونا۔“ وہ لہک کر بولا۔ وہ بھنا گئی۔ امریکہ میں اردو پڑھاتے ہوں گے۔

”میں بالکل پشیمان نہیں۔ بس ناظمہ کا خیال تھا۔ وہ آزر رہے۔“

”اووغ۔ خیر۔ خیر۔ کسی وجہ سے کسی کے خیال سے سہی۔ آپ آئیں تو سہی۔ معذرت کے لیے یا مجھے معاف کرنے۔“

”معاف کرنے۔“

وہ مزید کچھ کہتی مگر سب کے سب اندر گھس آئے۔ جنید، عبید، نائلہ، اسما، ناظمہ، جنید، عبید اس کے گرد ڈانس کرنے لگے۔ ”راضی راضی راضی۔ دو لہا، دہن راضی۔ پھر کیا کرے گا قاضی۔“

”لو۔ ہمیں خبر ہی نہیں اور یہاں ایجاب و قبول بھی ہو گئے۔“

نائلہ دوڑتی ہوئی آئی تھی اس لیے ہانپ رہی تھی۔ پروا انہیں حیرت سے دیکھ رہی تھی جو سب ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے اور جنیب سے تو جنید کی کشتی ہو رہی تھی۔ وہ چپکے سے نکل آئی۔ وہ سب اپنے بھائی کی گت بنانے میں مصروف تھے۔

ناظمہ کی شادی میں عمر بھائی اکیلے آئے۔ بھابھی کی طبیعت ناساز تھی۔ اس لیے نہیں آئیں۔

جئے جئے جئے

ایک دن وہ کالج سے آئی تو پھپھو بڑے جلال میں تھیں۔ کسی پر خفا ہو رہی تھیں۔ کوئی کوئی لفظ یا فقرہ اس کے کانوں سے ٹکرایا۔ تو علم ہوا کہ عمر پر خفا ہو رہی ہیں۔

”سارا خط بسمہ کے خیالات سے پر ہے۔ ارے اس گاؤں کی نے یہ نہ سوچا کہ خط میں لکھ رہا ہوں کہ بسمہ۔ اور یہ بھی نہ یاد آیا کہ جب میں پروا کو لا رہی تھی تو اس سے کہہ کر آئی تھی۔ یہ میری چیز ہے۔ میرے جنیب کی امانت۔ وہ تو سب کچھ بھول گیا۔ ناظمہ کی شادی میں آیا تھا تب بھی میں نے معاملہ پختہ کر دیا تھا۔ کہا تھا کہ بیٹا۔ اب یہ نہ بھول جانا۔ اب یہ میری ہو گئی۔ ناظمہ کی شادی کے بعد۔ ذرا اس کے امتحان ہو لیں تو میں اعلان بھی کر دوں گی۔ حد ہو گئی۔“

تنویر بھابھی نے اسے بتایا کہ عمر نے پروا کو بلانے کا لکھا ہے۔ اس کے کئی بہت اچھے رشتے آئے ہیں۔ بسمہ کا خیال ہے کہ امتحان تو پرائیویٹ بھی دے دے گی۔ مگر رشتے نہیں آئیں گے۔ یوں بھی اس کی عمر نکلی جا رہی ہے وغیرہ۔ پروا سننا کر رہ گئی۔ بھابھی جو کہتی ہیں کر کے رہتی ہیں۔ وہ اسے چین نہیں لینے دیں گی۔ اب اسے ہر وقت تیار رہنا پڑے گا۔ کب ان کے حکم کی تعمیل میں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر جانا پڑ جائے۔ اسے اس اور پریشان دیکھ کر بھابھی اس کی دلجوئی کرتیں کہ وہ خوفزدہ نہ ہو۔

پھر ایک دن پھپھو جنیب کو لے کر لاہور چلی گئیں۔ جب تک آنہ گئیں۔ وہ ہوتی رہی۔ دعائیں مانگتی رہی۔ آخر اس دن وہ آ ہی گئیں۔

”خوب خبر لے کر آئی ہوں۔ بسمہ کے سامنے سب کچھ کہہ آئی۔“

”آپ نے حسب دستور لتے لیے ہوں گے یا لتے دیے ہوں گے عمر بھائی کو۔“ عبید حسب معمول گڑ بڑا گیا۔

”میں نے اسے صرف دھمکیاں دی ہیں۔ اور جتا دیا ہے کہ اب آئندہ وہ نہ بھول سکے گا۔“ پھپھو خوش تھیں۔

جنیب بھی خوش نظر آ رہا تھا۔ عبید نے پوچھا۔ ”یہ جناب کی بٹنسی کیوں باہر نکلی ہوئی ہے۔ ایس۔“ وہ مڑ کر بھابھی سے رجوع ہوا۔ ”بھابھی بٹنسی کی چھتیس۔ اس موقع کے لیے کیا مناسب ہے بھلا۔“

”تمہارا سر۔“ بھابھی ہنس۔ ”فقرے کا بیڑا غرق کر دیتے ہو تم۔“

”اچھا۔ بیڑا غرق ہوتا ہے۔ میں نے تو اس دن کہا تھا۔ بیڑا پار ہو گیا۔ لو یہ ہوا۔“

”جس موقع پر تم نے یہ جملہ بولا تھا۔ وہ بیڑا پار ہونا ہی درست تھا۔“

عمر بھائی اور بھابھی آئے اور ایک چھوٹی سی تقریب میں پھپھو نے اسے جنیب کے نام کی انگلی پھنا دی۔ عبید نے اسے حادثاتی منگنی کا نام دیا۔

”نہ عمر بھائی پروا کو بلاتے اور اچھے رشتوں پر اصرار کرتے۔ نہ امی اتنی جلدی یہ منگنی کرتیں۔“

ابھی جنیب کو تعلیم مکمل کرنے میں دو سال درکار تھے۔ پھپھو منگنی کے خلاف تھیں۔ ان کے خیال میں تو زبانی معاہدہ کافی تھا۔ مگر عمر جب اپنے باپ کے سامنے کیا ہوا وعدہ بھول کر ناظمہ کے بجائے بسمہ کو بیاہ لایا۔ تو پروا کو بھی کسی جنیب کا شکیب کے ساتھ روانہ کر سکتا تھا۔

بسمہ بھابھی تو پروا کے ٹھاٹھاٹ دیکھ کر دنگ تھیں۔ یہاں آ کر اس کا رنگ روپ بھی نگہ گیا تھا۔ اسے ہر خوشی میسر تھی۔ اس کی قدر تھی یہاں عزت تھی۔ تنویر بھابھی کی چاہت دیکھ کر تو بسمہ کے پٹنگلے لگ گئے تھے۔ اندر ہی اندر کھول رہی تھیں وہ اور پروا جو اپنی بھابھی کی مزاج شناس تھی۔ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ بھابھی حسد اور جلن میں مبتلا ہیں۔ اسے ڈرتھا کہ بھابھی اسے پھپھو کے گھر سے لے جانے کی ہر تدبیر کریں گی۔ وہ اسے خوش دیکھ کر سخت ناخوش تھیں لیکن اسے پھپھو کا آسرا تو تھا۔ جنیب تو پردیسی پنچھی اس کا کیا بھروسہ۔ بس ایک انگلی تھی جو اسے معتبر کر چکی تھی۔ اور بھابھی اسی کی وجہ سے تلملارہی تھیں۔ جنیب جیسا وجہ اور خوش مزاج اعلیٰ تعلیم یافتہ پروا کا نصیب بنے یہ انہیں کب گوارا تھا۔

پھپھو تو چاہتی تھیں نکاح بھی ہو جائے۔ مگر عمر اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ آخر بہن تھی ان کی۔

”تم اس قدر کھور دل کی مالک ہو۔ یہ سنگ دلی را اس نہ آئے گی تمہیں۔ پچھتاؤ گی۔“

جنید اس کے سر پر کھڑا کب سے بک بک کیے جا رہا تھا۔ وہ چپ چاپ بستر کی چادر جھاڑے گئی۔

”اتنی دور جا رہے ہیں بے چارے تو کیا میں بھیج رہی ہوں نہ جائیں۔“

”ایک ذرا سی فرمائش بھی پوری نہیں کرو گی تو زندگی کیسے گزرے گی۔ ارے وہاں جا کر بھول بھال گئے۔ کیسے یاد رکھیں گے یہ چہرہ مبارک۔ جب کوئی تصویر ہی نہ ہوگی۔“

”ناظمہ کی شادی میں۔ اتنی تصویریں تو اتاری تھیں تم نے۔“

”وہ سب پرانی ہو گئیں اور کوئی اکیلی تمہاری ہے بھی نہیں۔ کسی میں کسی کا سر ہے کسی میں کسی کا تھو بڑا۔“

”افو۔ ذرا سامان نہیں رکھ سکتیں تم۔“ عبید بھی شامل ہو گیا۔

”کون سا سامان۔“ وہ بن کر بولی۔

”سامان نہیں۔ مان۔ تین حرفی مان۔ چلو ان کے ساتھ ایک عدد فوٹو۔“

”مانو گے نہیں۔“ وہ کھسیا کر اٹھ گئی۔ جنید بھی ضد کا پکا تھا۔ جنب کو بھی پکڑ لایا۔ صاف ظاہر تھا اسے بھی مجبور

کر کے لایا گیا ہے ’نشانی‘ کے لیے۔ پروا کے پاس رہے جو۔ پروا خوب خفا ہوئی مگر فوٹو تو اتار دیا گیا۔

جنب کے جانے میں چند دن تھے جب عمر کا خط آیا۔ بسمہ کی بیماری کا بیان۔ پروا کو بلانے پر اصرار۔ پیچھونے

لکھ دیا۔

”بسمہ کی بہن بھی وہیں ہے اور ماں بھانج بھائی سب ہیں۔ کسی کو بلا لو۔ پروا کو امتحان کی تیاری کرنے دو۔“

پروا ڈر گئی۔ اس سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ بھابھی کی کوئی فرمائش رد کر دی جائے تو وہ آگ بگولا ہو کر کچھ بھی کر

سکتی ہیں۔

”لو۔ پروا کا تو رنگ ہی زرد ہو گیا۔“ تنویر بھابھی نے کہا۔ ”اس قدر ڈرتی ہو تم۔ وہ بھابھی ہے تمہاری یا جلا د

ہے۔ اب تم پر ان کا اختیار نہیں رہا پروا۔ کیوں ڈرتی ہو۔“

تنویر بھابھی سیدھی سادی محبت کرنے والی۔ وہ بسمہ کے زہر سے واقف بھی کیسے ہوتیں۔

جنب اسے کالج لے جاتے تھے اس دن ادھر ادھر گلیوں میں گھما کر وقت ضائع کرتے رہے۔

”کیا کر لیں گی دو۔ اب کچھ نہیں کر سکتیں۔ امی جان سے تو فکر نہیں لے سکتیں نا۔“

”وہ کسی سے ڈرتی نہیں ہیں۔“

”اور تم سب سے ڈرتی ہو۔ اسی طرح ہمت بڑھائی ہے تم نے ان کی۔ بھتی زندہ رہنے کے لیے حوصلہ بلند رکھنا

چاہیے۔ معلوم نہیں کب کوئی حادثہ ہو جائے اور یہ تمہاری بھابھی کسی حادثے سے کم نہیں۔ مگر میں بھی اتنا کمزور نہیں۔ امی

نے تمہیں اس حادثے سے بچانے کے لیے ہی تو میرا انتخاب کیا ہے۔“

”مگر آپ۔ آپ تو بہت دور چلے جائیں گے۔ یہاں تو نہ ہوں گے یہاں تو بھابھی ہوں گی اور میں۔“

”اور تم اب میری ہو۔ کیا بھابھی تمہیں۔“

”گاڑی چلائیں دھیان سے۔ سامنے دیکھیں ناں۔ ڈر لگ رہا ہے مجھے۔“

”افو۔ کیا میں تمہیں کوئی نقصان پہنچنے دوں گا۔“

”مجھے آپ کے دل کے اندر کا حال معلوم نہیں۔“ وہ شرارت سے بولی۔

”پھر سے کہنا۔“ وہ خفا ہو کر بولے۔

”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ پتا نہیں یہاں کیا ہو جائے۔ آپ۔ آپ تک خبر پہنچنے تک تو میں۔“

وہ رنجیدہ ہو گئی، ہونٹ کاٹنے لگی۔

”سنو جب بھی تمہیں کوئی تکلیف ہوگی، مجھے ضرور علم ہو جائے۔ جب بھی کسی پریشانی میں پڑو۔ مجھے پکارنا۔ میں

کسی نہ کسی طرح پہنچوں گا۔“

”ہا۔“ وہ لا پرواہی اور رنج کے ملے جلے لہجے میں بولی۔

”کون آتا ہے اتنی دور سے۔ وہ بھی میرے لیے۔ میں اتنی بھی اہم نہیں ہوں، اپنی حیثیت جانتی ہوں۔“ اس کی

آواز بھاری ہو گئی۔

”آزما کر دیکھنا۔ وہ مرد ہی کیا جو اپنے وعدے پورے نہ کرے۔“ وہ یقین بھرے لہجے میں بولے۔ ”اور ہاں۔

میں عشق محبت کا دعوا تو نہیں کرتا کیونکہ میں ایک عملی آدمی ہوں اور یہ تو امریکہ جا کر ہی بتا سکوں گا کہ تمہاری کیا اہمیت ہے

لیکن پروا میرے خلوص پر بھروسہ کر سکتی ہو۔ میں نے عہد کیا ہے کہ تمہیں دکھوں، محرومیوں، تکلیفوں سے ضرور بچاؤں گا۔“

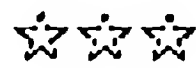
پروا دھک سے رہ گئی۔ سامنے بڑا سا پتھر بیچ سڑک پر پڑا تھا، باتوں کی رو میں حبیب نے دیکھا ہی نہیں۔ گاڑی

پتھر سے ٹکرا کر اچھلی۔ پروا جھٹکا کھا کر ڈلیش بورڈ سے ٹکرائی۔

”ہے۔ یہ کیسا وعدہ ہے۔“ وہ چلائی اور سر سہلانے لگی۔

”سوری۔ سوری۔ سوری۔“ وہ بھی زور سے بولا اور کار روک کر اس کے زخم ٹٹولنے لگا۔

”کچھ نہیں ہوا ہے۔“ وہ چڑ گئی۔ ”زندگی سوری سوری کے سہارے گزرتی اچھی نہیں لگے گی۔“



امتحانات سے فارغ ہو کر ہر بوجھ اتر سا گیا۔ ناظمہ سرال سے آگئی۔ جنیب اور زوہیب کے جانے کے بعد میں کچھ سکون اور ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ پھر اسماء کے ساتھ پھپھو جج کی سعادت کے لیے روانہ ہو گئیں۔ وہ اور بھابھی سلائی میں مصروف ہو گئیں جنید، عبیدان لوگوں کا دل بہلائے رکھتے۔

اچانک عمر بھائی اسے لینے آ گئے۔ اس کا دل تو نہیں چاہا۔ مگر بھابھی نے کہا اب عمر لینے آ گئے ہیں۔ تم چلی جاؤ۔ اُمی جان کی واپسی پر آ جانا۔ اس کے دل کو کوئی مروڑے ڈال رہا تھا۔ نہ جا۔ نہ جا۔ چڑیوں کی چہکار سے ایک ہی نغمہ ابھرتا۔ نہ جانا۔ نہ جانا۔ اسے ہر سمت سے سرگوشی سنائی دے رہی تھی۔ خطرہ۔ خطرہ۔ ہوائیں گواہی دے رہی تھیں۔ رک جا۔ رک جا۔ پتے ملتے۔ تالی بجاتے تو کہتے۔ خطرہ۔ خطرہ۔ فضا میں ہوائیں، خلا میں زمین و آسمان کہیں پر عافیت نہ تھی۔ خطرہ خطرہ۔

وہ عمر بھائی سے بحث نہ کر سکی۔ دبی زبان سے کہا ضرور کہ پھپھو کے آنے کے بعد آ جاؤں گی۔ ابھی بھابھی اکیلی ہیں۔ ناظمہ بھی جا چکی تھی مگر عمر بھائی کچھ پریشان سے تھے ان کی پریشانی میں اضافہ نہ ہو۔ یہ سوچ کر روانہ ہو گئی۔ جنید نے کہا کہ وہ چند دن بعد آ کر لے آئے گا۔

بھابھی کا موڈ حسب توقع بگڑا ہوا تھا۔ گھر کی حالت ابتر تھی۔ صفائی تھی نہ ترتیب، بکھرا بکھرا سامان، الٹی سیدھی کرسیاں۔ یہاں وہاں کشن، صبر۔ صبر میرے دل، بھابھی کے طنز کے تیروں کے وار وہ صبر کی ڈھال پر روکتی رہی۔ دو تین دن گھر کی صفائی میں لگے۔ پتا نہیں اسے تو عمر بھائی بھی کچھ چپ چپ ڈرے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ کئی بار غور کیا، بات سمجھ میں نہ آئی۔ اب بھابھی عمر کے سامنے بھی اس پر وار کرتی رہتیں۔ وہ چپ رہتے۔

آخر کار اسے بولنا پڑا۔

”بھابھی۔ اپنے گھر کوئی کیوں آتا ہے۔“ مجبوراً ہی جواب دیا تھا۔

”گھر جہاں ہے وہاں میں ضرور پہنچاؤں گی۔“

عمر بھائی نے کچھ کہا تھا۔ وہ چلانے لگیں۔ عمر بھائی چپ رہ گئے۔ پھر نیکی سے کچھ مہمان اترے۔ پھر کچھ اور۔۔۔۔۔ پھر اور۔۔۔۔۔ اور گھر بھر گیا۔ گھر بھر چکا تھا۔

”کل تمہاری شادی ہے میں نے طے کی ہے اب چین سے بیٹھو۔ بہت من مانی کر چکیں۔“

بھابھی پر غصے کا بھوت سوار تھا۔ وہ سہم کر دو قدم پیچھے ہٹی۔ عمر نے پرامید بھری نگاہ ڈالی۔ وہاں بھابھی کی قبر آلود نگاہوں کا سایا تھا۔ پلکیں جھپک کر رہ گئے۔

”بھائی۔ یہ..... یہ کیا ہے۔ بھابھی کیا کہہ رہی ہیں۔“ آواز کی کپکپاہٹ روکے نہ رکی۔ عمر نے سر جھکا لیا۔

”بھائی۔ بھائی۔ پھپھو۔ پھپھو.....“ منہ کھل نہ سکا۔ حلق میں نمک کے گولے پھنس گئے۔

”پھپھو..... ہو نہ ان بڑی بی کو میں جواب دے لوں گی۔ تم اس کی پروا نہ کرو۔ اور بس بہت سوال و جواب ہو

گئے، چلو اب کمرے میں۔“

بھابھی نے اسے گھسیٹا۔ وہ زار و قطار روتی ہوئی عمر کو دیکھتی رہی۔ کمرے میں لے جا کر بیٹھ کر بھابھی نے منہ

بگاڑ کر اس کے رونے کی نقل اتاری پھر کہا۔

”متلنی ہو گئی ہے، ہو نہ۔ ارے متلنی کیا چیز ہے۔ ہم شادی کریں گے اپنی مرضی سے۔ اب رونا بند کرو منخوس۔“

رونا دھونا۔ خوشامد، آہ و زاری، کھانا چھوڑنا۔ کچھ کارگر نہ ہوا۔ بھابھی نے اس کی شادی اپنے کسی ماموں کے

ساتھ طے کر دی تھی۔ ایک مہمان بی بی نے اس کو بلکتے دیکھ کر کہا بھی۔

”بسمہ! ظلم نہ کرو، یہ تو ابھی بچی ہے۔“

”بچی! اس بچی نے میری زندگی حرام کر دی ہے۔“

بھابھی نے دانت پیسے۔ وہ بے خطا تھی۔ کس سے کہتی۔ ظالم نے ہر سمت سے راستے بند کر رکھے تھے۔ رات

آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ رورو کر حلق خشک ہو گیا۔ فریاد کر کر کے آواز بیٹھ گئی۔

”مجھے بچالو۔ مجھے بچالو۔“ کسی انجان سے مخاطب ہو کر چلاتی رہی۔ ”پھپھو۔ پھپھو آ جائیں۔ مجھے بچالیں۔

میرے مولا! مجھے اس عذاب سے بچا۔“

روتے روتے تکیہ تر ہو گیا۔ آنکھیں سوچ گئیں۔ بال الجھ گئے۔

صبح ہوئی تو قیامت کا منظر تھا۔ شادی کی تقریب کا سماں۔ صحن میں کاغذ کی رنگین جھنڈیاں لگی تھیں، کرسیاں آراستہ

تھیں او خدا۔ تو کہاں ہے۔ عمر ہاتھ ملتے ادھر سے ادھر بندہ لاچار کی تصویر بنے پھر رہے تھے۔

”بھائی!“ حلق کی ساری طاقت لگا کر ایک بار پھر بھائی کو پکارا۔ ”کہاں گیا وہ وعدہ پھپھو سے کر کے آئے تھے“

جنیب مجھے آکر بچالو۔ تم نے کہا تھا نا۔“ رورو کر ساری توانائی ختم ہو گئی تو وہ بے ہوش ہو گئی۔ پڑوس کی جیلہ بھابھی نے

اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کیں۔ دوپہر ہوئی، پھر شام بھی ہو گئی۔ کیسی دہن تھی وہ کسی نے مہندی لگائی تھی نہ اس

کے اہن ملا تھا کسی کو اس سے ہمدردی نہ تھی۔ وہ سب بھابھی کے رشتے دار تھے پھر بارات بھی آ گئی۔ شور قیامت تھا۔ وہ

پھر بے ہوشی۔

”مگر کر رہی ہے۔“ بھابھی نے فتویٰ صادر کیا۔ ”چلو قاضی سے کہو نکاح پڑھائیں۔“

”مگر دولہا نہیں ہے۔ نشے میں غٹ پڑے تھے بہت اٹھانے کی کوشش کی۔ جگایا، بلایا، جھنجھوڑا۔ یاد دلایا کہ آج شادی ہے مگر انہیں ہوش نہ تھا۔“

بھابھی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”کیسے ہو تم لوگ۔ زبردستی اٹھالاتے۔ چلو میں خود جا کر لاتی ہوں، قاضی صاحب کو روکنا۔“

بھابھی ایک دو لڑکوں کو لے کر دولہا کی تلاش میں روانہ ہو گئیں۔ ذرا سی مہلت ہی ملی تھی۔ اس نے پھر فریادیں شروع کر دیں۔

”اللہ! میرے اللہ۔ مجھے بچالے آج اس عذاب سے نجات دلا دے مولا۔ یا مجھے موت دے دے۔“

\*\*\*

صدف نے بڑے عجز سے درخواست کی تھی۔

”بس چند منٹ لگیں گے مجھے، پلیز افضل تم ذرا انتظار کرنا میرا اچھا۔ دو منٹ میں آتی ہوں۔“

افضل نے سیٹ پیچھے کھسکائی۔ پیرپار کر نیم دراز ہو گیا۔ آنکھوں پر ٹوپی رکھ لی۔

”میں تمہارے دو چار منٹ کی حقیقت جانتا ہوں۔ جاؤ بابا۔“

باہر سے کسی تقریب کا سماں لگ رہا تھا۔ صدف حیران تھی کہ آج بسمہ کے گھر کیا تقریب ہے، اسے بتایا تک نہیں۔ وہ بسمہ کو پکارتی ہوئی اندر گھسکی تو۔ پردا سے سامنا ہو گیا۔

تباہ حال۔ سو جے ہوئے چہرے، دھوئیں جیسی رنگت اور پڑائے ہونٹوں پر فریاد۔

”صدف آ پا! صدف آ پا مجھے بچالیں۔ کہیں چھپا دیں مجھے نہیں کرنی شادی۔ صدف آ پا۔“

صدف کے سنبھالتے سنبھالتے وہ اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔ ناتوانی سی ناتوانی تھی۔

جمیلہ بھابھی نے آگے آ کر صدف کو بتایا۔ ”بسمہ اپنے بڑھے ماموں سے پردا کی شادی کر رہی ہے۔ نشے باز بھی ہے مولا۔ دو بیویاں بھاگ چکی ہیں۔ اور اب پردا کو چنا گیا ہے۔“

پردا کا حال تباہ تھا۔ پہچانی نہیں جاتی تھی۔

صدف نے عمر سے رجوع کیا۔ وہ گردن جھکا کر منمنانے لگا۔ جمیلہ بھابھی نے صدف کو اکسایا۔

”وقت بہت کم ہے۔ بہت ہی کم ہے۔ پتا نہیں کب وہ بے ہوش دولہا کو لے کر آ جائے۔ ہم تو محلے والے ٹھہرے



ہمیں تو یہیں رہنا ہے۔ مکان سر پر تو اٹھا کر کہیں جا نہیں سکتے، ورنہ پروا کے لیے ضرور کچھ کرتے۔ بے چاری صبح سے چار دفعہ بے ہوش ہوئی ہے۔ دیکھو جی، بغیر مرضی کے نکاح کرنا تو گناہ ہے۔“

صدف نے پروا کو دیکھا، چہرے پر مردنی چھائی ہوئی۔ خشک ہونٹ، سو جی سو جی آنکھیں، بے بسی اور معصومیت کی تصویر مظلوم۔ اسے مدد کی واقعی ضرورت ہے۔ وہ دوڑتی ہوئی گھر سے نکل گئی۔

افضل نے غصے سے گھڑی کی جانب دیکھا۔ پھر صدف کی طرف اور اسٹیرنگ پر ہاتھ جمادیے۔

”جلدی آؤ مجھے سخت بھوک لگی ہے آدھا گھنٹہ ہو گیا۔ تمہارے دو منٹ ابھی ختم نہیں ہوئے۔“

”افضل۔ ذرا رو۔“ صدف کی سرگوشی پر اسرار لہجہ..... وہ گھبرا گیا۔

”افضل۔ ایک بے تصور لڑکی پر ظلم ہو رہا ہے اور ہمیں اسے پہچانا ہے ضروری ہے۔“

”کیوں۔ تم خدائی فوجدار ہو۔“

”افضل! برائے خدا لڑکی نے مجھے خدا رسول کے واسطے دیے ہیں۔ پلیز میری مدد کرو۔“

دس منٹ افضل کو تیار کرنے میں لگ گئے۔ وہ مجبور ہو گیا۔

”تم کو میرا بھروسہ ہے نا۔ پھر بھی یقین دلاتی ہوں۔ تم کبھی مایوس نہیں ہو گے۔ بس اسے ہر حال میں اس گھر سے

لے کر جانا ہے۔ بعد کے معاملات میں سنبھال لوں گی۔“

دس منٹ عمر کو سمجھانے اور واسطے دینے میں لگے، پروا کو سارا معاملہ سمجھانے میں ایک منٹ لگا۔ وہ پھر بلک بلک کر

رودی۔

”اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں پروا۔ بسمہ میری دشمن ہو جائے گی۔ اگر تم کو کہیں لے بھی جاؤں تو وہ تمہیں برآمد

کر دے گی اور مجھ پر اغوا کا جرم ثابت ہو جائے گا۔ سوائے عمر بھائی کے کوئی اور تمہیں چھپا نہیں سکتا۔ اور وہ..... وہ میرے

ساتھ تعاون پر تیار ہیں۔“

انسان جو خود کو بہت بلند و برتر سمجھتا ہے، اعلا وارفع تصور کرتا ہے مگر خدا کی قوت..... اس کی حکمت کے آگے سب

بے بس ہیں۔ بسمہ کی ساری منصوبہ بندی، ارادے دھڑے رہ گئے۔ اس کے حسد کا انجام اس کے لیے خواہ کچھ ہوا ہو۔

پروا اس عذاب سے نجات پا چکی تھی۔ جس کے لیے رو رو کر غنائیں کر رہی تھی۔

افضل نے دماغ پر بہت زور ڈالا کہ یاد آ جائے۔ کبھی اس نے کوئی بڑا گناہ کیا تھا۔ جس کی سزا میں اسے صدف

جیسی جلد باز، متلون مزاج لڑکی سے سابقہ ہوا ہو۔

پردہ کی رخصتی بھی خوب تھی، سارے مہمان دور کھڑے تھے یا کہیں نہ کہیں کھانا کھا رہے تھے۔ انہیں دلہن کی رخصتی سے ذرا دلچسپی نہ تھی۔ قاضی صاحب کو بھی جلدی تھی۔ وہ نکاح پڑھا کر چھوہاروں کی پوٹلی بغل میں دبا کر تیزی سے نکلے۔ رومال میں کھانا بھی بعد میں کسی نے ان کے گھر تک پہنچایا وہ تو لمبے لمبے ڈاگ بھرتے بسمہ کی پہنچ سے دور چلے گئے۔

صدف پردہ کو لے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھی۔ افضل نے گلاب کا موٹا سا ہار پیچھے اچھال دیا۔ اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

”پلیز آہستہ۔“ صدف کہتی رہی اور بے ہوش پردہ کو سنبھالتی بھی رہی۔ گھر کا دروازہ آیا تو گاڑی رک گئی۔ افضل اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ ”اب کیا کروں۔“

”اب اسے اٹھا کر اندر لے چلو۔“ افضل نے احتیاط سے پردہ کو سنبھال لیا۔ اندر پہنچ کر پوچھا۔

”اچھا اب کیا کرنا ہے۔“

”مہربانی کر کے طنز مت کرو۔ یہ قدرت کا انعام ہے جو تمہارے ظرف کے امتحان کا نتیجہ ہے سمجھے۔ نہ یہ خود سے بھاگ کر آئی ہے نہ ہی تم اسے پکڑ کر لائے ہو۔ اس کے وارثوں نے تمہاری رضا پر اسے درجنوں لوگوں کے سامنے تمہارے ہاتھ میں دیا ہے۔ اب وقت ہی بتائے گا کہ میں سرخرو ہوئی۔ یہ بہت مجبور بے کس لڑکی ہے، لیکن کبھی بھی تمہیں مایوس نہیں کرے گا۔ کبھی تمہیں افسوس نہیں ہوگا اور..... خدا کی رضا بھی یہی ہے۔ کہ تم اس کے نگہبان بنو۔ سو بن گئے اب مجھ سے سوال مت کرنا۔“

صدف نے کچھ نرمی کچھ گرمی کا مظاہرہ کیا۔ اس کی رات ایک بجے فلائٹ تھی۔ وہ انہیں چھوڑ کر اپنے ہاسپٹل چلی گئی۔ جہاں سے اسے بہت جلدی میں ایئر پورٹ پہنچنا پڑا۔

اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ گھر پہنچ کر بسمہ کو حالات کا علم ہونے کے بعد کسی قسم کا غم و غصہ کا دورہ پڑا تھا کہ ہاتھ ملنے کا بھی موقع نہ ملا۔ آگ میں جلتی وہ اسی وقت صدف کے ہاسٹل گئی تو اسے بتایا گیا کہ وہ فلائی کر گئی ہے وہاں کسی کو بھی افضل کی قیام گاہ کا علم نہ تھا۔ بسمہ پر دوہری ناکامی کا غلبہ تھا اور اس ناکامی کا انتقام وہ عمر سے لینا چاہتی تھی۔ لیکن عمر کے کچھ عزیز..... اور محلے کے معززین اس کی پشت پناہ بن گئے تھے۔

پردہ اکرے میں بے سدھ پڑی تھی، ہوش میں تھی مگر نقاہت سے اٹھ بھی نہ پاتی تھی۔ بس بھابھی کے انتقام سے بچ جانے کا اطمینان تھا لیکن یہ دوسری صورت بھی تو قابل قبول نہ تھی۔ اسی کے خوف سے لرزہ بر اندام پڑی تھی۔

افضل بھی کم پریشان نہ تھا۔ صدف اسے امتحان میں ڈال گئی تھی۔ بغیر کسی ارادے کے وہ شوہر بنا دیا گیا۔ ایسا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ لڑکی کی سرد آہیں اور مدھم سسکیاں اسے رنجیدہ کر رہی تھیں۔

وہ گرم دودھ لے کر کمرے میں آیا تو لڑکی کانپ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کچھ کہنے کی کوشش بھی کی۔ مگر اس کے کانٹے لیوں سے کوئی آواز نہ نکلی۔ افضل اتنا نا سمجھ بھی نہ تھا کہ اس کا مطلب نہ سمجھتا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ ایک عمر رسیدہ نشے باز شخص کے ساتھ زبردستی اسے بیاہا جا رہا ہے، لڑکی کی مرضی نہیں ہے، اسے پہچانا ہے، اس نشے باز سے اور اس دشمن بھابھی سے۔ لڑکی کو افضل سے شادی پر بھی تو مجبور کیا گیا تھا۔ خود اسے بھی صدف نے واسطے دے کر مجبور کیا۔ لڑکی کی حالت خاصی تشویش ناک تھی۔ وہ نقاہت سے لرز رہی تھی، خوف سے زرد ہو گئی تھی۔ شاید اس کی مرضی کہیں اور ہو۔

افضل نے بڑی نرمی اور ملائمت سے اسے پورا دودھ پلا دیا۔ تسلی دی کہ وہ خود کو محفوظ سمجھے۔ صدف کے آنے تک وہ اس کا ہر طرح خیال رکھے گا۔ پھر صدف فیصلہ کرے گی کہ آئندہ کیا ہو۔ کیونکہ اس نے اسے یقین دلایا تھا کہ بس لڑکی کو اس کی بھابھی کے چنگل سے بچانا ہے اور اس نے یہ کام کر دیا تھا۔ اب آئندہ لائحہ عمل خود لڑکی کو طے کرنا ہے۔ یا صدف کا مشورہ۔ اس نے خود کو بری الذمہ قرار دیا تھا۔ افضل نے واضح طور پر لڑکی کے اطمینان بھرے سانس کی آواز سنی۔ وہ گھر کے دوسرے کمرے میں چلا آیا اور صوفے پر گر پڑا۔ تھکن سے برا حال تھا۔ نیند اس سے روٹھ گئی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے جا کر جھانکا تو وہ بے خبر سوئی ہوئی تھی۔ اس نے افضل کی شرافت پر یقین کر لیا تھا یا وہ نیند کی ترسی ہوئی تھی۔ وہ جو زبردستی اس کی زندگی میں داخل کر دی گئی۔ اب کیا طے کرے گی۔ پتا نہیں کس مزاج کی ہے۔ صدف نے تو ہر طرح یقین دلایا تھا۔

رات تین بجے فون کی گھنٹی نے اسے ڈسٹرب کیا۔ حسب توقع صدف تھی۔ ایئر پورٹ سے بول رہی تھی۔  
 ”وہ کیسی ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا اس کی۔ کچھ کھلایا پلایا اسے۔“ وہ بہت بے قرار ہو رہی تھی۔  
 ”وہ تو ٹھیک ہے مگر میں... میں... میں۔“

”میں سمجھ گئی تم بکرا بن گئے ہو۔ میاں ہے ہو۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”میں ایسے مذاق پسند نہیں کرتا۔ سنو صدف، آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔“

”انشا اللہ۔ انجام بخیر ہوگا۔ تم اس کا خیال رکھنا، افسوس کہ مجھے آج ہی جانا پڑ رہا ہے۔ ورنہ میں اس کی دیکھ بھال کر لیتی۔ اسے محبت کی نرمی اور گرمی کی ضرورت ہے، اسے تحفظ کا یقین دلاؤ۔“

”سنو۔ سنو صدف میں کوئی فرشتہ نہیں ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس حیثیت سے میرے گھر میں رہے گی۔ اور کب تک۔“

”مجھے معلوم ہے کہ تم انسان ہو اور اس پر کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے۔ اور یہ لڑکی جائز بیوی ہے تمہاری اس میں

بھی کوئی شک نہیں۔ افضل جو کارنامہ تم نے سرانجام دیا ہے نا۔ وہ تمہیں فرشتوں کی صف میں کھڑا کر چکا ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں۔ وہ ہوش میں آ کر صدمے کے اثر سے نکل کر میری اس بات کی گواہی دے گی اچھا ہاں۔ اس کے لباس وغیرہ۔“

”ہونہ۔ وہ گواہی دے گی لیکن تمہیں ماننا چاہیے کہ میرے ساتھ تم نے نہایت نامناسب رویہ رکھا۔ ناجائز دباؤ ڈالا۔ اور خود اس لڑکی کو بھی مجبور کیا کہ وہ کھائی سے بچے تو غار میں جا کرے۔“

”نہیں۔ میں نے ہر مصیب سے بچانے کا عزم کر کے تمہارا انتخاب کیا تھا۔ سمجھ لو کہ اسے جہنم سے بچالیا ہے۔ اب اسے جنت دینا تمہاری ذمہ داری ہے۔ کم از کم ایک فرشتے کی پشت پناہی اسے حاصل ہوگی۔ ہیں نا۔“

صدف کے ہنسنے کی آواز آئی اور فون بند ہو گیا۔ وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ صدف کے لیے تو ہر مرحلہ آسان ثابت ہوتا تھا۔ خود افضل کے لیے ہی وہ دشواریاں پیدا کرتی جاتی تھیں ہمیشہ ہر دفعہ اپنے ارادے اپنے فیصلے اپنی ضدوں کے نتائج سے لا پرواہے نیاز ہو کر افضل کو آزمائشوں میں مبتلا کرتی رہی تھیں۔ سر میں سخت درد تھا اور تشکرات کا بوجھ بھی۔ دفتر سے چھٹی لینے پر مجبور ہو گیا۔ صبح آنکھوں میں کٹ گئی۔ اپنے لیے چائے بنا رہا تھا تو اس کا خیال بھی آ گیا۔ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ جاگی ہوئی تھی۔ بیٹھی تھی آنسو تو اسے اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

”ہیلو۔“ اس نے نارمل انداز سے مخاطب کیا۔ وہ جھٹ سے منہ پھیر کر آنسو خشک کرنے لگی۔

”او..... گرم گرم چائے پیو۔ اور سارے آنسو اس میں ڈبو دو۔ اور سب غم بھلا دو۔“

اس نے نیم مزاحیہ انداز اختیار کیا۔

”کیونکہ اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ صدف نے کہا ہے کہ۔“

وہ اس کے چہرے پر نظر ڈالنے میں ناکام رہا کہ اس نے گردن موڑی ہوئی تھی۔ بالوں کی موٹی سی چوٹی۔ خوبصورت گول سر۔ اور کانوں میں جھومتی بالیوں سے بھی مخاطب ہونا پڑا۔ ”صدف نے کہا ہے کہ چونکہ میں نے تمہیں جہنم سے نجات دلائی ہے اس لیے میں فرشتوں کی صف میں کھڑا ہو گیا ہوں۔ صدف نے یہ بھی کہا ہے کہ سب کچھ جائز طریقے پر ہوا ہے کسی کا کسی پر احسان نہیں۔ کوئی دباؤ نہیں لیکن تمہارے یہ آنسو تو کوئی اور کہانی سنار ہے ہیں کیا تمہیں اس جہنم سے نجات ملنے کی کوئی خوشی نہیں۔ اچھا چلو میری طرف منہ کر کے بیٹھو۔ ورنہ میں بہت برا آدمی ہوں زبردستی بھی کر سکتا ہوں۔“ لڑکی کے منہ سے چیخ نما سسکی خارج ہوئی۔

”اوہو۔ اتنا بھی برا نہیں کہ تم چیخیں مارو۔ میں تو محاورہ کہہ رہا ہوں فرشتے سے تو..... برا ہی ہوں اور تمہیں یہ بتانا

چاہتا ہوں کہ جس طرح تم اس جہنم سے نکلنے کے لیے میرے گھر آنے پر مجبور ہوئیں، مجھے بھی مجبور کیا گیا، ہماری مشرقی تاریخ میں تو یہ سہرے لڑکیوں، عورتوں کے سر بندھے ہیں۔ ہزاروں مجبوریاں رقم ہیں۔ لیکن ایک آزاد منش، دیدہ دلیر قسم کے مرد کے لیے یہ چویشن قطعاً نئی ہے۔ نہ میری دادی جان نے خاندان کے وقار کی قسم دے کر مجبور کیا نہ ابا جان نے اپنی زبان کے وقار کا واسطہ دیا۔“

وہ پیالی اس کے سامنے کر کے اس کے منہ سے لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ لڑکی نے فوراً ہاتھ سے پکڑ لی۔  
 ”مجھے تو ایک ڈکٹیٹر قسم کی خاتون نے ہمدردی کے نام پر اور واضح ہو کہ یہ ہمدردی صرف تمہارے لیے تھی۔ مجھ سے تو ان کا مخالفانہ رویہ روز اول سے جاری ہے۔ زندہ مثال ہوں ان کے ظلم و ستم کی۔ جن کے حکم کی پابندی پر مجبور کیا گیا۔“  
 لڑکی نے ایک گھونٹ بھرا تھا، سوسوسوں کی آواز بھی نکالی سسکی۔ افضل نے فوراً اپنا رومال پیش کیا۔  
 ”تو محترمہ۔ آپ بھی ذرا میری مجبوریوں پر رحم کھائیں۔ مجھے ناشتے کی اشد ضرورت ہے۔ سر میں سخت درد ہے۔ صرف چائے پیش کرنے پر ناوم ہوں۔ اپنی اور میری مدد کرنا آپ پر فرض ہو گیا ہے۔ آئیے کچن دکھا دوں۔ آنسوؤں سے منہ تو دھو چکی ہیں آپ۔ پھر بھی اگر پانی سے منہ دھونا ہو تو سائیڈ میں باتھ روم بھی ہے۔“  
 پروا کھڑی ہو گئی۔ منہ دھو چکی تھی۔ وہ افضل کے عقب میں چل پڑی۔  
 کچن خاصا کشادہ مگر بے ترتیب تھا۔

”جب صدف آتی ہے۔ مجھے گالیاں دیتی ہے میری لا پرواہی اور پھوہڑ پنے کو کوستی ہے اور کچن درست کر کے جاتی ہے۔ خیر تلاش کرنے پر سب کچھ مل جائے گا۔ میں بھی نہیں بتا سکتا کہ کون سی چیز کہاں ملے گی۔ میں ذرا غسل کراؤں۔“  
 وہ کہہ کر چلا گیا تو پروا کی جان میں جان آئی۔ صفائی پسند لگتا ہے بے ترتیبی ہے مگر گندگی نہیں۔ یہ صدف اس کی کون ہے۔ جس کے حکم سے وہ مجبور ہو گیا۔ پتا نہیں صدف نے کس حق کے تحت اسے رضا مند کیا ہو گا۔ ان کا آپس میں کیا رشتہ کیا تعلق ہے۔

یوں تو صدف کے ساتھ ایک دو بار اس نے افضل کو دیکھا تھا۔ مگر وہ گھر میں کبھی نہیں آیا۔ صدف کو چھوڑ کر چلا جاتا تھا۔ اور اس وقت جب اسے کسی فرشتے کی ضرورت تھی، صدف نے اس کی ہر امید کو بامراد کیا وہ اور کرتی بھی کیا۔ افضل تھا تو صدف بھی کامیاب ہو گئی۔ ورنہ صدف آپا۔ آپ کا احسان ہے کہ آپ نے مجھے۔ ایک غیر بے وسیلہ لڑکی کے دکھ کو محسوس کیا اور اپنی ذمہ داری پر عمر بھائی کو بھی مجبور کیا۔ نہ آپ آتیں۔ نہ میں زندہ ہوتی، بھابھی کے ماموں کے گھر میں۔ خوف سے آنکھیں بند کر کے اس نے شکر ادا کیا۔ وہ کم از کم زندہ تو تھی اور زندگی کے سارے لوازمات کے ساتھ۔ حوصلے

امنک امیدیں زندہ تھیں۔ صدف نے اسے بچا لیا تھا۔ وہ کبھی فرشتہ نکلی اور افضل بھی۔

آلیٹ وہ بنا چکی تو پراسٹے ڈالنے لگی۔ بھوکی آئی تھی۔ جب جان نکلی جا رہی تھی۔ اپنے بھائی کے گھر سے بھوکی آئی تھی۔ جب بھابھی نے اسے شادی کی نوید دی۔ تب سے دانا پانی حرام ہو گیا تھا۔ رات کے دودھ نے کچھ توانائی بخشی۔ کچھ منہ نہ۔ بیڈروم میں میز پر ناشتا رکھ دیا۔

افضل فوراً شروع ہو گیا۔ اور پسندیدگی کا اظہار آنکھوں اور بھونوؤں سے کر رہا تھا۔ اس کا انداز گفتگو اور حرکتیں جنید کی طرح تھیں۔ حالانکہ اس کے لیے بھی یہ سچویشن پریشان کن ہونی چاہیے لیکن مرد زیادہ قوت برداشت رکھتے ہیں۔ شاید یہ وجہ ہو۔ اس کے کسی انداز یا عمل سے فکر کا اظہار نہ ہوا۔ وہ سر جھکائے ناشتا کر رہی تھی آنکھیں بار بار بھرا آئیں۔ افضل مگر خوش تھا۔ اس نے پروا سے اس کا نام دریافت کیا۔

”مجھے علم تو ہونا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ کسی موقع پر ضرورت پڑے تو اغوا کا الزام بھی لگ جائے۔ پھانسی ہے اغوا کی سزا ہاں کیا نام بتایا آپ نے۔“

”پروا.....“ حلق میں لقمہ پھنس گیا۔

”ہاں۔ اچھا۔ تو یہ پرواز بیگم کوئی عجیب سا نام نہیں۔“

”پروا ہے نام۔ صرف پروا۔“ اپنے نام کی تکرار عجیب لگ رہی تھی۔

”اچھا خیر۔ نام سے کیا ہوتا ہے۔ پروا ہو کہ پچھوا۔ ہوا تو سانس کی آمد و رفت برقرار رکھنے کے لیے بہت ضروری ہے شکر ہے تمہارا نام ہوا پر ہے۔ آگ پر نہیں۔ مجھے تو شمع نام سے بھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں جلا نہ ڈالے اچھا تو پروا۔ بات یہ ہے کہ میں تو اب سوؤں گا۔ رات بھر جاگا ہوں دراصل میں واقعی فرشتہ نہیں۔ جب ایک جوان حسین مہکتا ہوا وجود سامنے ہو تو بڑے بڑے پرہیزگار ایمان کھو بیٹھتے ہیں اور میرا تو حق ہے۔ نکاح ہوا ہے باقاعدہ آپ سے ہے نا۔ لیکن کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا۔ سخت گناہ سمجھتا ہوں صدف نے کہا تھا ابھی تو اسے اس گھر سے نکالنا ہے۔ بعد میں دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے تو جناب صدف کے آنے تک میں بھی پابند ہوں اور آپ بھی۔ آپ بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر میرے بارے میں غور کر لیں۔“

پروا کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ سانس تیز ہو رہی تھی یہ کیسی باتیں کر رہا تھا۔

”آپ کے سامنے تو مجبوری در مجبوری تھی مجھے قبول کرنے کے لیے۔ مگر میرا تو کوئی پروگرام نہ تھا۔ چاہتا تو انکار کر دیتا لیکن آپ کو مصیبت سے بچانا بھی چاہتا تھا۔ صدف جو چاہتی ہے مجھ سے کرا لیتی ہے اور میں..... خیر آپ ناشتا

کریں۔ سوچیں۔ ممکن ہے آپ کی جلا دصفت بھابھی اپنے کیے پر پشیمان ہوں لیکن عمر بھائی ہمارے حامی ہیں۔“  
 پروا سر جھکائے ناشتا کرتی رہی، بہت بھوک تھی اور اس کی خیند پوری ہو چکی تھی، افضل دوسرے کمرے میں سونے چلا گیا۔ وہ سوچتی رہی۔ انگلی میں پھپھو کی پہنائی انگلی کی موجودگی میں وہ افضل کے بارے میں کیا سوچے۔ عمر بھائی نے بھی اس کے نکاح میں اتنی عجلت کی، وہ بھابھی سے انکار کر دیتے تو یہ نوبت کیوں آتی۔ صدف کی مہربانی اور ہمدردی، بھابھی کی غیر موجودگی عمر بھائی کے لیے اس فیصلے پر عمل کرنے میں معاون بنی۔ پتا نہیں عمر بھائی، بھابھی سے اتنا کیوں ڈرتے ہیں اور معلوم نہیں ان کا یہ فیصلہ..... عارضی ہے کہ۔ وہ بھی اس کی طرح پر امید ہیں۔ پھپھو کے منتظر۔

لیکن افضل نے یہ کیوں کہا کہ اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ نکاح ہوا ہے جائز یہ وہ کیا ان کی نیت کچھ اور ہے۔ کیسا آدمی ہے یہ۔ فرشتہ نہیں لیکن شریف ہے۔ رات اس نے کتنی مہربانی کی۔ تسلی بھی دی اور دودھ بھی اصرار کر کے پلایا۔ ورنہ وہ شاید رات میں بھوک سے ہی مرجاتی اور اب سوچنے کا آرڈر دے گیا۔ کیا اب واقعی کچھ نہیں ہو سکتا۔ پھر صدف کی واپسی تک پابندی کا کیوں نام لیا۔ اب پھپھو کے تاثرات۔ جنیب کے خیالات کیا ہوں گے۔ کیا وہ اتنے وسیع القلب ہیں۔

اس نے بھابھی کا کچھ نہیں بگاڑا مگر انہوں نے۔ اس کی زندگی کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ کس سے فریاد کرے۔ چچی اماں نے اس پر ظلم کیا۔ اسے مسترد کر کے۔ پھر بھول ہی گئیں۔ تب اس نے بھی انہیں ان کے سلوک کو بھلا دیا۔ صبر کر لیا۔ پھپھو، تنویر بھابھی، جنید، عبید، جنیب۔ سب لوگ اس کے غموں کی تلافی کر رہے تھے۔ لیکن بسمہ بھابھی کے بس نے تو تباہی کے کنارے کھڑا کر دیا تھا۔ صدف آپا کا بھلا ہو۔ پھر صدف افضل کی کون ہے۔ اسے اتنا حق کس نے دیا کہ افضل پر حکمرانی کرے۔

”ہیلو! کھانے کے بارے میں کیا خیال ہے۔“

وہ باہر سے ہی پوچھ رہا تھا۔ پروا چونک کر اٹھ بیٹھی خیالوں میں گم تھی۔ پھپھو، چچی اماں اور جنیب جس کو پکار پکار کر حلق خشک ہو چلا تھا۔ وہی تو بربادی کا سبب تھا۔ نہ پہناتا انگلی۔ کبھی مل گیا تو سوری کہہ کر گزر جائے گا، وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا۔ وہی ہوا جس کا اسے خدشہ تھا۔ جنیب تک خبر پہنچنے تک وہ تباہ ہو چکی ہوگی۔ یہ تو صدف کا احسان تھا۔ کم از کم اس بڑھے نشے باز سے تو جان بچی ورنہ..... یا مرجاتی یا اسے مار کر پھانسی چڑھ جاتی۔

افضل بازار سے کھانا لے آیا تھا۔ کھانا کھانے کے دوران افضل نے پانی کا گلاس اسے دیتے ہوئے پروا کی انگلی دیکھی۔

”یہ انگلی..... منگنی کی تو نہیں۔“ وہ خاصا ذہین تھا۔

پروا کے دل پر چوٹ لگی۔ روٹی پائیٹ میں رکھ کر وہ سکھنے لگی۔ بڑی زور کار ونا آیا تھا۔

افضل اسے روتا دیکھتا رہا۔ اچھا تو یہ بات ہے پھر تو کوئی جذباتی وابستگی بھی ہوگی کچھ دیر بعد اس نے روٹی کا ٹکڑا پروا کے ہاتھ میں دے کر سنجیدگی سے کہا۔

”کھانا کھاؤ۔ رونے کے لیے تو عمر پڑی ہے زندگی میں ایسے حادثے ہوتے ہیں۔ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ ان سے ہارنا اپنے وجود کی نفی ہوتی ہے۔ ارے اپنا وجود بہت قیمتی ہوتا ہے۔ اس کی قدر کرؤ قدر چلو کھانا کھاؤ۔“  
افضل کے لہجے میں اپنائیت تھی۔ بالکل جنیب کی طرح۔ جس نے کہا تھا حادثے زندگی میں ہوتے ہیں تمہاری بھابھی کبھی حادثے سے کم نہیں جن سے بچانے کے لیے امی نے مستثنیٰ کر دی ہے۔ پھپھو اور جنیب نے اسے بھابھی سے بچانے کے لیے مستثنیٰ کی تھی مگر وہ پھر بھی نہ بچی۔ بھابھی حادثے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی تھیں۔ پھر صدف آپا نے ان سے بچانے کے لیے اس کی شادی ہی کروادی۔ ”عمر بھائی..... عمر بھائی! کاش! آپ پر بھابھی اتنی حاوی نہ ہوتیں۔“  
”مایوسی گناہ ہے شکر کرو کہ اس عذاب سے بچ گئی ہو۔“

اس نے پروا کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اور پروا کو محسوس ہوا جیسے اس کے سر پر آسمان ٹھہر گیا ہو۔ کوئی نہ کوئی تھا۔ جو اس پر حق رکھتا تھا۔ کسی حادثے کے طور پر سہی۔ مگر اب وہ تہا نہ تھی پہلے کی طرح۔ دنیا دکھاوے کے لیے سہی۔ وہ اب خود کو بے سہارا نہ کہے گی۔ اس کے دل کو تسکین سی ہوئی آنسو خود بخود رک گئے۔ اور وہ پھر سے کھانا کھانے لگی، افضل نے بھی پھر کچھ نہ کہا۔ وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔

جئے جئے جئے

شام خاصی دل آویز تھی۔ افق پر آسمان سرخ ہو رہا تھا جس کی نارنجی شعاعیں ماحول کو گلابی کر رہی تھیں، نیلا آسمان نارنجی شعاعیں۔ گلابی بادل، گلابی فضا میں چہرے کی زردی بھی غائب ہو گئی تھیں اور آنکھیں بھی اب پرانی کیفیت میں آگئی تھیں۔ آنکھوں کی سو جن ختم ہو گئی تھی اور دل بھی کچھ ٹھہر سا گیا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی، افضل باہر گیا..... واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک بنڈل سا تھا اور وہ ایک خط پڑھتا آ رہا تھا۔ خط صدف کا تھا۔

”مجھے یقین ہے کہ جناب نے پروا کے لباس کا کوئی انتظام نہ کیا ہوگا اور بے وقوفوں کی طرح دنیا سے منہ چھپائے گھر میں گھسے بیٹھے ہو گئے۔ افضل! کیسے ہو تم۔ ارے بابا اب تم بچہ نہیں رہے شوہر بن گئے ہو۔ بنا دیا گیا ہوں ہماری فلاسٹ لیٹ ہو گئی۔ اب صبح پانچ بجے جائے گی۔ میں اور آصفہ جنرل اسٹور گئے۔ سپر مارکیٹ گھومے پھر کہیں پروا کے لیے چند چیزیں دستیاب ہوئیں۔ اب تم اس کو لے کر اس کے بھائی کے گھر جانا۔ کچھ دیر ٹھہر کر آ جانا پروا کو ہرگز وہاں نہ



چھوڑنا۔ کسی قیمت پر نہیں اب وہ تمہاری ذمہ داری ہے سمجھتے ہو۔ تمہارے تحفظ میں ہے وہ بسمہ بہت کینہ پرور ہے اور اس وقت زخمی ناگن بنی ہوئی ہوگی، خیر میں یہ بندل سلمیٰ کو دے جاؤں گی۔ وہ کسی کے ذریعے پہنچا دے گی۔ دیکھو پروا کا خیال رکھنا۔ یا تو چند دن کی چھٹی لے لو یا پھر اسے اس کی پھپھو کے گھر پہنچا دو۔ ٹھیک۔ اچھا بھئی شاید میرا یہ ٹپ کچھ لمبا ہو جائے۔

خیر کی طالب۔ صدف۔“

افضل نے بندل اور خط پروا کے سامنے پھینکا اور باہر نکل گیا۔ خط پڑھ کر پروا متاثر ہو گئی۔ صدف آ پا! آپ تو سچ مچ فرشتہ رحمت ہیں۔ بندل میں گہرے سبز رنگ کی خوبصورت بنارسی ساڑھی تھی۔ جس میں آتش گلابی اور او دے رنگ کا بارڈر تھا۔ سنہری نیل والا بارڈر ڈمکتی ہوئی شوخ رنگ کی ساڑھی۔ پروا کا پسندیدہ رنگ۔ فیروزہ زئی اور سرخ رنگ کے دو سادہ سوٹ بھی تھے۔ ڈبے میں سبز رنگوں کی جیولری۔ میک اپ کا ضروری سامان اور سرخ چوڑیاں۔

صدف کو اس کا کتنا خیال تھا۔ افضل کو خط پڑھ کر غصہ آ گیا تھا۔ وہ اپنا غصہ کم کرنے کے لیے کہیں چلا گیا تھا۔

”صدف آپ میری وجہ سے خاصی زیر بار ہوئیں۔ اتنا سامان لے لیا۔“

”کوئی زیر باری نہیں ہے اسے عادت ہے ہر کسی کی ہمدردی میں سب کچھ خرچ کر ڈالتی ہے۔ صرف میں ایسا بندہ بشر ہوں جس پر اپنے احکامات نازل کرتی ہے۔“ وہ بھنایا ہوا تھا۔

”چلیں۔ یہ اس کی بھیجی ہوئی ساڑھی زور و غیرہ اٹھا کر پہن ڈالیں۔ جس پر اپنا پیسہ پھینکا ہے اس نے۔ پھر چلتے ہیں اس کے حکم کی تعمیل میں۔“

پروا کو اب بھابھی کا خوف نہ تھا جب سے افضل نے اس کا آسمان بننا منظور کیا۔ اور صدف نے اس کے راتے صاف کیے اس کی مہربانی اور لطف و عنایت خوش کن پھوار کی مانند اس کے دل کو تازہ کر رہی تھی۔ رنج و فکر کے ڈیرے اکھڑ چکے تھے۔ وہ تنہا نہیں تھی۔ وہ حسین رنگ شوخ قسم کی ساڑھی پہن کر باہر نکلی تو لمحہ بھر کو تو افضل بھی گڑبڑا گیا۔ کون ہے یہ پری۔ رات والی اجڑی خزاں زدہ لڑکی یہ تو ہو نہیں سکتی۔

جب وہ بھائی کے گھر پہنچے مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ عمر بھائی نہیں دیکھ کر حیران اور خوش ہوئے بھابھی سامنے کھڑی تھیں۔ اسے دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ حلقوں سے ابلنے لگیں پھر وہ ایک دل دوز چیخ مار کر بھاگیں اور اپنے کمرے میں بند ہو گئیں۔ عمر بھائی شرمندہ سے ہو گئے۔ پروا بھی کھسیانی ہو گئی۔

”بس یہی حال ہے۔“

عمر بھائی نے تاسف سے کہا، وہ معذرت طلب نظروں سے افضل کو دیکھنے لگے اس شخص سے کل تک وہ واقف بھی نہ تھے اور آج وہ دندنا تا ہوا ان کے گھر آ گیا تھا۔ انہوں نے بغور پروا کو دیکھا، قیمتی ساڑھی اور زیورات میں میک اپ کیے وہ بہت مختلف اور معزز نظر آ رہی تھی۔ کل سے بہت مختلف بالکل بدل گئی تھی، اعتماد سے بیٹھی تھی اور شاید خوش بھی تھی۔ انہیں بھی یہ امید نہ تھی کہ وہ اگلے دن اس سچ و سچ کے ساتھ آ جائے گی۔

جب بسمہ نے دروازہ کھولا تو عمر بھائی پڑوس سے جمیلہ بھابھی کو بلا لائے۔ یہ بہت بے تکلف ہستی تھیں اور ان ہی نے صدف کو اکسایا تھا۔ کہ وہ کچھ بھی کر کے پروا کو بڈھے سے بچائے آتے ہی اسے گلے لگا کر بولنا شروع کر دیا۔

”ہائے۔ ماشا اللہ۔ لشکارے مار رہی ہے پروا۔“

”بھائی جی، ذرا دیکھیں، یہ کل والی پروا تو نہیں نا۔ اور سناؤ خوش تو ہو یہ ہیں تیرے دوہا۔ کل تو ڈھنگ سے دیکھ نہ سکی تھی۔“

انہوں نے تڑچھی نظر سے افضل کو دیکھا۔

”ہائے بڑا سوہنا ہے، ماشا اللہ چاند سورج کی جوڑی ہے، خوش تو ہے نا تو۔ خوش نہ ہوتی تو کمال تھا..... اللہ بنائی رکھے، بھائی جان دیکھیں، ایک یہ جوڑی ہے اور آپ لوگ اسے بڈھے کے حوالے۔ خیر بھائی جی میں ان کے لیے چائے لاتی ہوں، مٹھائی تو ہوگی گھر میں۔“

وہ اندر جانے لگیں تو افضل نے روکا۔ یہ کہہ کر ابھی چائے پی کر آئے ہیں اور مٹھائی کی گنجائش نہیں۔

”بس جمیلہ بھابھی۔ آپ تو کسی طرح بسمہ کو کمرے سے باہر لے آئیں۔“

عمر نے جمیلہ بھابھی سے منت کی پتا نہیں کیسے۔ مگر بھابھی آ گئیں۔ تیوری پر ہل لیے منہ سجائے، پروا نے کھڑے ہو کر سلام کیا مگر وہ بغیر جواب دیے کئی کترا کر کونے میں جا بیٹھیں اور دور سے ہی انہیں گھورنے لگیں۔ جمیلہ بھابھی کی کنسٹری بغیر توقف کے جاری رہی۔

”اے بھابھی۔ دیکھنا کیا بہار دار ساڑھی ہے پروا کی اور بیچ بھی رہی ہے اس پر۔ اور یہ سیٹ دکھانا۔ ہوں۔ زمر کا ہے نا۔ منہ دکھائی میں دیا ہوگا دوہا نے، اری ایسی اچانک شادی میں یہ سیٹ بھی دے دیا۔ خاصا قیمتی ہے پیسے والا لگتا ہے۔“

بسمہ کی طرف مڑ کر پھر شروع ہو گئیں۔

”نیلیم کو بری میں چڑھایا تھا خالہ نے، پچاس ہزار کا تھا۔ تو خاصا بھاری ہے، ساڑھی بھی بہت خوبصورت ہے، اری پروا۔ ذرا ٹھہر تو ابھی آئی۔“ کہہ کر چھپاک سے وہ باہر نکل گئیں۔

پروانے صحن میں نظر ڈالی۔ رات کی تقریب کے آثار جوں کے توں موجود تھے جگہ جگہ پچکے ہوئے چاول، ہڈیاں، بوٹیاں، روٹی کے ٹکڑے بکھرے تھے اور کھیاں ضیافت اڑا رہی تھیں۔ پروانہ گزر گیا۔ بھابھی نے صفائی تک نہیں کرائی۔ شکر ہے افضل آڑ میں ہیں، انہیں صحن نظر نہیں آئے گا۔ بھابھی کو یوں بھی صفائی سے لگاؤ نہ تھا۔ وہ کتنا صاف رکھتی تھی، آٹکھن، بھابھی تو اپنی ناکامی کا سوگ منا رہی ہوں گی۔ انہیں گندگی کا خیال تک نہ ہوگا۔ افضل اور عمر بھائی، بے تکلفی سے محو گفتگو تھے افضل نے کسی بات پر قہقہہ لگا کر پروا کو دیکھا۔ نظر نیچی کیے وہ ہاتھ کی لکیروں کا معائنہ کر رہی تھی۔ خاصی حسین لگ رہی ہیں محترمہ۔

لپک جھپک جمیلہ بھابھی آئیں۔ توے میں انگارے لیے مرچوں کی دھونی دیتی ہوئی، پروا اور افضل پر سے وار کر تو اب ہر صحن میں رکھ آئیں۔

”ہاں بھئی۔ نظرات اُتار دی ہے میں نے تو۔ نظر لگتے دیر نہیں لگتی۔ میری بھی لگ سکتی ہے۔ ماشا اللہ دولہا خوش تو ہے۔ کیوں نہ ہو آخرا ایسی سونا چاندی جیسی دلہن مفت میں مل گئی۔ بے منگلے۔ اری پروا۔“

انہوں نے اچانک آواز دھیمی کر کے سرگوشی میں پوچھا۔ مگر ایسے کہ بھابھی بخوبی سن لیں۔  
 ”شکرانے کے نفل بھی پڑھے تو نے۔ ارے اس بڑھے، نشے باز سے چھٹکارا جو مل گیا اور کیسا گھبرو دولہا ملا۔ ایں۔ نصیبوں کی بات ہے، پر ہمیں دعائیں دو، اچھا دیکھو اب شکر ادا کرتی رہنا اور دولہا کو ہمیشہ خوش رکھنا، اس کے اشارے کو حکم سمجھنا۔ اسی میں عاقبت سنورے گی، سنا خدمت کرنا خوب۔ اس کی خوشی کو اپنی سعادت جان لینا۔ ارے جتنا شکر کرے گی اتنی ہی خوشی ملے گی۔“

بھابھی کی گھورتی شعلہ برساتی نگاہیں، پروا ڈر گئیں۔  
 ”اری رات مزا آ گیا۔ جب بھابھی اس بڑھے کو لائیں کچی وہ تو قبر کا مردہ لگ رہا تھا۔ یوں جھوم رہا تھا جیسے ڈانس کر رہا ہو۔ فٹے منہ اس کا۔“

افضل نے مڑ کر پروا سے کہا۔ ”چلیں اب۔“ وہ فوراً کھڑی ہو گئی، لٹش لٹش کرتی گہرے سبز رنگ کی ساڑھی میں اس کا نو خیز بدن اور روپ چمک رہا تھا۔ بھابھی نے شرما حضور کہا۔

”آج تو پروا کو ہمیں ٹھہرنا ہے، یہی قاعدہ ہے زمانے کا۔“  
 جمیلہ بھابھی چمک کر بولیں۔ ”ہوہ۔ اس کے گھر میں کون بیٹھا ہے، ساس نہ نند، پھر کون طریقے قاعدے دیکھنے والا ہے، نہیں پروا، تم جاؤ۔ اللہ تمہیں آباد رکھے۔“ انہوں نے آنکھ کے اشارے سے بھی منع کیا۔

بھابھی کب تک خوش اخلاقی کا نقاب اوڑھے رہتیں بڑبڑ کرتی چلی گئیں۔

عمر بھائی نے کہا۔ ”آج میری طرف سے ڈنر ہوگا۔ چلو پروا تمہاری پسند کا چائیز چلے گا۔“

پروا نے ہچکچا کر کہا۔ ”بھابھی کو بھی۔“

”چھوڑ اسے۔“ جمیلہ بھابھی نے بات پوری نہ ہونے دی ہاتھ لہرا کر بولے گئیں۔ ”وہ تو جل جل کر کوئلہ ہو رہی

ہے تجھے دیکھے دیکھے کئے ہائے ماشا اللہ۔ تو بھی تو حد ہے اتنی سچ رہی ہے کہ بس ماشا اللہ تیری بھابھی کے تو سارے منصوبے دھڑے رہ گئے وہ بڑھا بھی روتا ہوا واپس گیا۔“

جمیلہ بھابھی ان لوگوں میں تھیں جن کے دل اور زبان ساتھ ساتھ بولتے تھے انہیں یہ لحاظ نہ تھا کہ کوئی برا نہ مان

جائے اور پھر انہی نے صدف کو پوری بات بتائی تھی۔ وہ پروا پر اپنا حق نہ جتاتیں۔

واپسی میں عمر بھائی کو گھر چھوڑتے ہوئے اپنے گھر کی سمت سفر شروع ہوا تو پروا کے دل پر ہلکی سی ٹھیس لگی۔ کیا تھا

اگر وہ ایک رات رک جاتی عمر بھائی نے کہا ہی نہیں۔

”یہ خاتون تو خاصی دلچسپ تھیں۔ ان سے دوستی گانٹھی جائے بڑے گراتے ہیں انہیں۔ کیا خیال ہے ان کی

ہدایتوں نصیحتوں پر عمل کرنا ہے۔ اگر میں کچھ کہوں کچھ چاہوں۔ ان کی نصیحت کے مطابق مانو گی۔“

افضل نے مسکرا کر انگلی اٹھائی جیسے جمیلہ بھابھی سامنے بیٹھی ہوں پروا گردن جھکائے بیٹھی رہی۔ گھر آ گیا تھا۔ وہ

اتر کر پہلے اندر گئی اور اپنے کمرے میں بند ہو گئی کپڑے بدل کر ساڑھی کی تہہ لگا رہی تھی تو وہ اپنے کپڑے لینے آ گیا۔

صدف کے بھیجے فیروز کی سوٹ میں خاصی کم عمر لگ رہی تھی۔ آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

”واہ صدف تو پہنچی ہوئی چیز ہے کیا صحیح اندازہ ہے اس کا۔“

وہ سیٹی بجانے لگا وہ شرمائی اور پلنگ پر بیٹھ گئی دوپٹہ دور رکھا تھا۔

”وہی تم چھپنے والی چیز تو نہیں ہو البتہ چھپانے والی کہہ سکتے ہیں دل میں دروازہ بند کر لو نیت خراب ہوتے دیر

نہیں لگتی۔“

وہ سیٹی بجاتا اپنے کپڑے لے کر باہر چلا گیا۔ پروا دم سا دھم بیٹھی رہ گئی۔

عجب اتفاق ہے کہ صبح وہ ناشتہ کر رہے تھے تب ہی دو خواتین اندر آ گئیں۔ افضل نے کھڑے ہو کر بڑے تپاک

سے خیر مقدم کیا۔ پھر عمر رسیدہ خاتون کی سوالیہ معترض نگاہوں کے جواب میں کہا۔

”خالہ جی یہ میری وہ ہے اور یہ میری خالہ ہیں۔ یہ زہر ہے خالہ کی بیٹی۔“ وہ خود ہی بول رہا تھا کسی سے مخاطب نہ تھا۔

خالہ نے آنکھیں نمچا کر پروا کو دیکھا۔ ”ایں۔ کیا کہا۔ کون ہے۔“

”آپ کی بہو خالہ آئیے ناشتا کریں۔ بڑے مزے کے کھانے بناتی ہے آپ کی بہو۔“

”ہائیں شادی کب ہوئی۔ مجھے تو خبر تک نہ ہوئی۔ اکیلے اکیلے شادی کر لی۔ ارے کوئی گواہ بھی ہے۔“  
وہ تکیے انداز میں گھورے جا رہی تھیں۔

”بس خالہ مجبوراً کر لی دیکھیں نا۔ اماں کو بھی خبر نہ ہو سکی۔ جلدی تھی۔ ایمر جنسی جانتی ہیں آپ کسی کو بلانے کا

دھیان ہی نہ آیا۔ آئیے بیٹھے ناں۔ زہرا کھڑی کیوں ہونا شتا کر دنا۔ تمہاری بھابھی نے مزیدار پرائٹسے بنائے ہیں۔“  
زہرا منہ موڑ کر بد بدائی پھر دونوں ماں بیٹی چلی گئیں۔ افضل فکر مند ہو گیا۔

”یہ سلسلہ تو غلط ہو گیا۔ اب یہ اماں کے پاس جائیں گی اور اماں۔ میری اور بہت سی خطاؤں میں یہ جرم بے گناہی بھی ان کی خفگی کا سبب بنے گا۔ اوہ صدف صدف۔“

وہ سر تھامے کھڑا رہا۔ اس سے ناشتا بھی نہ ہوا۔ پھر کمرے میں جا کر کھڑ پڑ کر تار ہا۔ واپس آ کر بولا۔

”محترمہ! تیاری کر لیں۔ چلتے ہیں امی حضور کی عدالت میں‘ گاؤں کی سیر بھی کچھ بری نہیں ہوگی۔ نہ سہی کا غان‘  
سوات‘ مری۔ جیسی ہماری شادی ہوئی ہے ویسا ہی ہنی مون ہوگا۔ اماں کے ہاتھوں درگت‘ ہاہ کیا قسمت ہے۔ ابھی تک  
اماں کے ہاتھوں مار کھاتا ہوں سچ۔“

”آپ چائے تو پی لیں۔“ پروا سے رہا نہ گیا اور افضل نے شاید اس کا دل رکھنے کو دو گھونٹ چائے پی لی۔

گاؤں کا سفر خامد لچپ رہا۔ وہ مسلسل مزاحیہ انداز میں اسے قصے سناتا رہا لیکن ایک بار بھی اس سے کوئی سوال  
نہیں کیا۔ منگنی نہ منگیتر شاید بھول گیا تھا۔ البتہ اپنے اپنی ماں کے واقعات۔

”اماں میری شادی ابا کی بھتیجی سے کرنا چاہتی ہیں۔ میری بہنیں مجھے اپنی مندوں سے چپکانا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔  
اوہ سب کے ارادوں پر اوس گرے گی۔ واہ۔ صدف جب انہیں علم ہوگا کہ صدف نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے تو۔ مہربانی  
کر کے تم تو کسی طرح اماں کو راضی کر لینا۔ وہ تم سے خوش ہو جائیں۔ بس پھر مجھے بھی معافی مل جائے گی۔“

کھیتوں کے فوراً بعد افضل کا گھر تھا۔ کچی سڑک پر دھول اڑاتی کار جب گھر کے سامنے رکی تو گاؤں کا کوئی بچہ  
وہاں نہ تھا۔ وجہ یہ کہ یہ گھر اصل آبادی سے خاصا پہلے تھا۔ ہارن کے جواب میں بڑے میاں آئے‘ کمان جیسی کمر سفید  
بھک بال۔

”بابا۔ اماں کا مزاج کیسا ہے۔“

”ابھی تک تو ٹھیک تھا۔ پر یہ تیرے ہارن نے گڑبڑ کر دی۔“

”کیوں خیر ہے۔ چٹلی کے کئے بھوری کی بچھیا یا کالی مرغی کے چوزوں کو میرے ہارن نے ڈسٹرب کر دیا کیا۔“

اچھا وہ بکری بہری ہو گئی ہوگی۔“

”چل چل۔ باتیں نہ بنا۔ اندر جا۔ اور یہ کس کو لے آیا ہے۔ صدف بی بی۔“

”نا۔ نہیں بابا۔ چلو تم اندر چلو۔“

پردا کا بازو پکڑ کر وہ گھر کے اندر لے آیا۔ یہاں استقبال کے کوئی آثار نہ تھے۔ اماں بوری سے چاول نکال کر صاف کر رہی تھیں۔ ملازما کیں ان میں نمک ہلدی لگا کر ڈرم میں ڈال رہی تھیں۔ کچے صحن میں کہیں کوئی تنکا نہ تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے دبے قدموں بڑھ رہا تھا۔

پردا کی جان نکلی جا رہی تھی۔ یہ ایک اور امتحان بڑی بی بی اسے ربجیکٹ نہ کر دیں۔

”ماں میں آ گیا۔ السلام علیکم۔“

ایک ٹائی کو تو یوں لگا جیسے بڑی بی بی تھرا گئی ہیں۔ اٹھنے کو ہوئیں پھر ارادہ ملتوی کر کے بیٹھی رہ گئیں۔ نظریں چاول کے تھال پر پتھر کی جگہ چاول اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگیں۔ اندر سے یقیناً کچھ اور تھیں۔ ظاہر میں سخت گیر۔ وہ برآمدے میں گھس کر ان سے لپٹ گیا۔

”اماں۔ اماں میں آ گیا ہوں۔“

انہوں نے چاول کا تھال زمین پر رکھ دیا اور رسمی طور پر کمر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”اماں! یہ۔ یہ آپ کی بہو بھی آئی ہے۔“ کہتے ہوئے دانتوں میں زبان دبالی۔ ”بس اب اسے اپنے پاس ہی

رکھ لیں۔ اسے اپنا جیسا بنادیں۔ بہت لڑاکا ہے میرا گز نہیں ہوگا۔ اس لیے لے آیا ہوں۔ ذرا سی تربیت۔“

”چل ہٹ چپ رہ۔ مجھے دیکھنے تو دے۔“ حیرت انگیز طور پر اماں نے کسی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ اور بیٹے کو

دھکا دے کر ہٹا دیا۔ پردا زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ اماں نے اس کا چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں رکھ لیا اور غور سے دیکھا۔ پھر بیٹے کی سمت دیکھا۔

”کب ہوئی شادی۔“

”دو تین دن ہوئے بس تین دن۔“

”سچ بتا۔ کہاں سے لایا ہے۔“ سخت بدگمان خاتون تھیں۔

”نکاح نامہ لائی ہو کہ بھول گئیں۔“ وہ سختی سے بولا۔

”نکاح نامے بھی جعلی بنے لگے ہیں اب۔ سب جانتی ہوں میں۔ کوئی گواہ بھی ہے۔ ہے سوہنی وہ ہنسی۔“  
اماں نے پروا کو چھوڑ دیا۔

”اماں۔ گواہ بہت ہیں۔ صدف نے خود پسند کر کے میری شادی کی تھی۔ سچ اماں۔“

”اچھا چپ کر، تین دن میں بہو نے کتنی لڑائی لڑی ہوگی۔ جو کہتا ہے لڑا کا ہے۔ ایس۔“

اماں سوچ میں ڈوب گئیں، پروا چاول کی تھال اٹھا کر چننے لگی، ماں بیٹے میں دوری تھی پر کیسی۔ اماں کے انداز میں تپاک نہ تھا۔ جوش نہ تھا مگر شادی پر خفا بھی نہ تھیں۔ بدگمان تھیں۔ اماں کو سمجھنے میں کچھ وقت لگے گا۔

”اچھا۔ اماں۔ اب میں چلتا ہوں۔ سنبھال لو بہو کو۔“

”چل۔ جا کر منہ ہاتھ دھو۔ دھول میں انا ہوا ہے کمرے میں جا کر لیٹ جا۔ آیا وہاں سے لاٹ صاحب کا بچہ۔“

ابھی شبراتن کھانا لاتا ہے سونا۔ سونا شبراتن سے کہو تند و گرم کرے۔“

”اماں آپ کی بہو روٹی بہت کھاتی ہے شبراتن سے کہو چار بندوں کی روٹی پکائے۔“

کہتا ہوا وہ مسکراتا ہوا کہیں چلا گیا۔ اماں نے پروا سے تھال لے کر زمین پر رکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر پلنگ پر لے گئیں اور لگیں گھورنے۔

”لگتی تو خاندانی ہے۔“ سر ہلا کر فیصلہ کیا۔

انہیں پروا کے سر پر جما ہوا دوپٹہ نیچی نظریں، جھیکا ہوا سر پسند آیا تھا۔ خاندانی ہونے کی یہی دلیل ہے کہ عورت شرم و حیا سے رہے کھانے کے علاوہ پھر افضل سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اسے واپس جانے کی جلدی تھی۔ اور اماں پروا کو جانچنے والی نظروں سے دیکھے جارہی تھیں، جب اس کی چاپ دوسری طرف گئی تو اماں گردن موڑ کر ادھر دیکھنے لگیں، سرد مہری سے رخصت کیا تھا۔ کوئی جوش نہیں، دعا نہیں۔ شاید دل میں دی ہو دعا۔ پھپھو تو اپنے سب بیٹوں پر آیت الکرسی بھی دم کرتی تھیں اور دعائیں بھی دیتی تھیں۔ کارا اشارٹ ہو کر دور چلی گئی۔ تب اماں نے لمبا سانس کھینچا۔ شاید آو بھری۔ پھر پروا کو لپٹا لیا۔ چوما، پیار کیا۔ بار بار صدقے ہونے کا اعلان کیا اور نظر اتاری پھر۔

”شبراتن، بہو سوہنی ہے نا۔ اچھی ہے۔ اری ایسی تو پورے گاؤں میں نہ ہوگی ہے نا۔ ملوک ہے، کوئی تو اچھا کیا میرے بیٹے نے۔“

ان کی ساری گرم جوشی پروا کے لیے تھی۔ یا اس کے توسط سے افضل کے لیے بھی۔ شاید افضل کی کوئی خطا کوئی

فروگذاشت انہیں ناگوار گزری۔ وہ دل کی آواز کو دبانے میں کامیاب رہیں۔ اور محبت کے جہان کو سرد مہری کے سپرد کر دیا۔ افضل نے اسے یہ تو بتایا ہی نہ تھا کہ گاؤں میں کتنے عرصہ رہے گی پھر بھی مطمئن تھی۔ یہ نئی دنیا تھی پھپھو کے قصبہ بانی ماحول سے الگ بے حد سادہ اور پراسرار۔ صدف کون تھی۔ افضل سے اس کا کیا ناتا تھا۔ یہ معلوم نہ ہوا۔ شہراتن اور سونا۔ دن رات گھر میں رہنے والی ملازما نہیں تھیں مگر صدف کا نام آتے ہی بہانا بنا کر ادھر ادھر ہو جاتیں۔

یقیناً افضل سے ناراضگی صدف کی وجہ سے ہوگی۔ اماں کو صدف پسند نہ ہوگی۔ وہ اپنی پسند کی بہو چاہتی ہوں گی۔ جہاز میں اڑنے والی۔ نوکری کرنے والی لڑکی جس کے بال بھی کٹے ہوئے تھے دیہاتی اماں کو کیسے پسند آتی۔ لیکن تصدیق کہیں سے نہ ہوئی۔ البتہ انہوں نے پروا کو قبول کر لیا تھا بغیر کسی اعتراض کے اماں نے اسے بہت سے کپڑے بھی دیے۔ کچھ سلعے کچھ بے سلعے پروا کو سلائی کرتے دیکھ کر دیہاتی عورتیں انگشت بدنداں تھیں جو عین درزیوں جیسے کپڑے سیتی تھیں۔ اماں ہر عورت کو ہلا کر دکھاتیں۔

”دیکھو دیکھو یہ میری بہو نے خود اپنے ہاتھوں سے سبے ہیں۔“

وہ کچھ پکاتی تو اماں نہال ہو جاتیں۔ وہ بہت صفائی پسند تھیں۔ گھر میں کہیں کوئی بلا ضرورت چیز نہ تھی مرغیوں بکریوں گائے بھینس کا بازہ الگ تھا۔ اس کی صفائی بھی اپنے سامنے کرواتی تھیں۔ گھر میں مرد تو صرف بابا تھے افضل کے باپ کے زمانے سے تھے۔ پہلے زمینوں کی دیکھ بھال کرتے تھے اب گھر کی۔ افضل کی شادی شدہ بہنیں مسقط اور ریاض میں تھیں۔

اماں ہر تیسرے دن بابا سے خط لکھواتیں جو بہو کے کارناموں سے پر ہوتا۔ بہو بہت لائق فائق تھی۔ انجینئر، مستری سب کچھ بجلی کا کام بھی جانتی ہے فیوز جوڑ لیتی ہے استری کا پلگ لگا لیتی ہے کہیں سے تیار کٹ جائے تو اس کی پٹی کر کے کام کا بنا دیتی ہے گاؤں کے لوگ اپنے ٹوٹے پلگ لیے آ جاتے ہیں۔ بڑی سونپی ہے۔ یہ ٹیپ کا مصرعہ ہوتا۔



اس دن اس نے خواب میں جنید کو دیکھا پھر حبیب دن بھر اس کا دل بو جھل رہا۔ پھپھو جج سے دایسی پر عمر بھائی کے پاس آئی تو ہوں گی۔ کیا سنا کیا کہا ہوگا۔ وہ کتنی بے خبر تھی۔ افضل نے بھی خبر نہ لی۔ شاید عمر بھائی سے اس کا رابطہ ہوا ہو مگر وہ پھپھو کے بارے میں تو کچھ نہیں بتائیں گے۔

ہلکی ہلکی دھوپ میں خوشگوار حرارت تھی۔ وہ پلنگ پر لیٹی تو غنودگی سی طاری ہو گئی۔ اسی عالم میں کسی کار کے انجن کی ہلکی سی آواز۔ پھر قدموں کی چاپ اور السلام علیکم تو عین اس کے سر پر ہی داغا گیا۔ دعائے رحمت۔ وہ چونک کر اٹھ گئی۔



جنید نہ جنیب، افضل، شاید افضل ہی تھا اس نے خود کو ساس کی اوٹ میں چھپا لیا۔ اتنے دن بعد ہچکچاہٹ تو ہوتی ہے۔

اماں ساگ بنا رہی تھیں۔ اسی طرح کام میں لگی رہیں۔ افضل نے ایک بنڈل اس کی جانب پھینک دیا۔

”اچھا اماں۔ اب چلتا ہوں۔ ذرا جلدی میں ہوں۔ ادھر سے گزر رہا تھا۔ تو آپ کی خیریت لینے آ گیا۔ اب چلتا ہوں۔“ وہ بے چینی سے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا کھجا رہا تھا۔

اماں خفگی سے گویا ہوئیں۔ ”اچھا۔ کدھر سے گزر رہا تھا میرا بچہ۔“

”یہیں اے سلیمان گڑھ آیا تھا تو دفتر کا کام تھا۔“

”سلیمان گڑھ۔ ساٹھ کوس پر ہے اچھا بچے جو کہتے ہو وہی سچ ہوگا۔ پر یہ کہنے میں بھی کوئی حرج نہ تھا۔ کہ بیوی کی خاطر آئے ہوا اچھا۔ دیکھ لی شکل۔ چل اب لسا بن۔“ سخت غصے میں تھیں۔

افضل نے جھک کر ماں کے گھٹنے پکڑ لیے۔ ”سچ کہتا ہوں اماں صرف آپ کی خاطر آیا ہوں۔“

”پہلے تو اتنے پھیرے نہیں لگاتا تھا۔ اتنی جلدی اب آیا ہے تو چل۔ جو کام پہلے کرتا تھا۔ وہی کر۔ مانگ معافیاں۔ اسی کے لیے آتا تھا نا۔ اچھا چل کرے میں جا کر بیٹھ۔ یہ کیا لایا ہے۔“

”یہ لفافے پیڑ وغیرہ ہیں اپنے والوں کو لکھنا چاہیں تو لکھ دیں گی۔ یہاں لفافے کہاں ملتے ہیں۔ اس خیال سے اچھا اماں اب میں چلتا ہوں پھر آؤں گا۔“

پردا جیسی بیٹھی تھی بیٹھی رہی۔ انگلی میں انگوٹھی چمک رہی تھی۔ افضل ست قدم اٹھاتا صحن پار کر رہا تھا۔ شاید اس امید میں کہ پردا اسے خدا حافظ کہنے ہی آئے گی۔ مگر وہ ٹھس بیٹھی رہی۔ بعد میں بہت فسوس ہوا۔ اخلاقیات ہی کر لیتی۔ شاید کچھ دیر ٹھہر جاتا۔

اماں بھی خاصی اداس ہو گئی تھیں مگر خاموش تھیں۔ لا تعلق۔ بنڈل میں پیڑ تھے اور لفافے پاکستان ڈاک کے سعودی عرب کے لیے امریکہ کے لیے امریکہ کے لیے کیوں۔ دھک سے رہ گئی۔ انہیں کیسے خبر ہوئی کہ۔

رات کو پیڑ نکالا مگر کچھ لکھا نہیں گیا، کسے لکھے، پھپھو کو ناظمہ کو یا۔ ہاتھ کاٹنے لگے۔ اپنی مجبوری بے کسی کی داستان۔ اپنی ہتک اور شکست کا دکھڑا۔ کیا مدد مانگے۔ کیسی مدد۔ اپنی سرال میں بیٹھ کر۔ کیا دکھ ہے یہاں۔ کس کی شکایت کرے اور وہ اس کی مدد مدد بھی کیوں کریں گے، جب شادی کر لی تھی۔ رخصتی ہوئی پھر کس بات کا یقین دلائے، کتنا مشکل کام ہے یقین دلانا۔ کھڑکی سے پرے۔ تاحدنگاہ کھیت، ہریالی، خوشحالی اور بکے پھلوں کی مہک۔ کیا یہ امید ہے۔

”اب سو جا بہو۔ کیا کر رہی ہے۔ آرام کر لے۔ آ میرے پاس۔ آ جا۔“

اماں دوسرے کمرے سے اسے پکار رہی تھیں۔ لفافے پیڑ و ہیں رکھ کر وہ اماں کے پاس چلی گئی۔ رات سناٹا اور جھینگروں کی آوازیں۔ کہیں کوئی پرندہ چیخا۔ کیا یہ امید ہے۔

”بہو۔ ایک بات پوچھوں۔“

”جی اماں۔“

”آج تک میں نے سوال نہیں کیا بیٹی۔ آج عجیب لگ رہا ہے کیسے پوچھوں۔ افضل سے اڑ کر آئی تھی کیا۔ افضل نے کہا تھا یہ لڑاکا ہے میرا گزر نہیں ہوگا۔ کیوں دو تین دن کی شادی میں۔ ایسی کیا بات ہوگئی۔ آج بھی وہ آیا تیری خاطر اور چپ چاپ چلا گیا۔ دکھی نظر آ رہا تھا۔ پوچھ نہ سکی۔ تم نے بھی نہیں پوچھا۔ میں نے تو سارے حق خود سے چھین لیے ہیں۔“

اماں نے آدھ بھری۔ پروا تکیے میں منہ گھسائے پڑی رہی۔

”اچھا جو اس کی قسمت اکیلا رہ گیا میرا بچہ۔“

اماں نے سرد آدھ بھر کر تکیہ سینے سے لگا لیا۔ ان کی سسکی کی آواز آئی تھی۔ ماں بے آواز رو رہی تھی۔ پروا کو پہلی بار اماں اور افضل کے تعلقات میں گداز نظر آیا۔ ماں کی مامتا بے چین تھی پروا کی وجہ سے۔

اسے جسم میں جھرجھری سی محسوس ہوئی اور وہ اٹھ کر اماں سے لپٹ گئی۔ دبلی پتلی کامنی سی اماں مامتا سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ انہوں نے پروا کو اپنے اگلوتے بیٹے کی بیوی کو سینے سے لگا لیا۔

”وہ بہت نرم دل ہے۔ ہمدرد اور خیر خواہ دیکھ بہو۔ کبھی ایسی لڑائی نہ کرنا جو دل کو جا کر لگے‘ مرد کو اپنی عزت بہت عزیز ہوتی ہے اپنی عورت سے زیادہ عزت بچانے کے لیے محبت عورت‘ عیش سب قربان کر سکتا ہے مرد اور افضل۔ اس میں ضد بھی ہے پکا ضدی ہے ہٹ کا پکا۔“

اماں چپکے چپکے اسے مردوں کی عزت پر قربان ہونے کی داستانیں سنارہی تھیں۔ وہ سوگئی۔ افضل نے کہا تھا اماں سخت مزاج ہیں ان کا سینہ گہرا غار ہے۔ جہاں تاریکی کے سوا کچھ نہیں۔ مگر پروا کے ساتھ ان کا سلوک کوئی اور کہانی سناتا۔ بغیر کسی تصدیق کے۔ کسی ناراضگی کے اظہار کے بغیر وہ پروا پر محبتیں لٹا رہی تھیں۔ مامتا سے لبریز مگر اپنی انا کی سختی سے محافظ انہوں نے ایک بار بھی افضل سے سرد مہری کے سلوک کی وضاحت نہ کی۔ وجہ بھی نہیں بتائی۔ ادھر صدف بھی ایک سربستہ راز تھی۔ اگر افضل سے معلوم کیا جاتا تو وہ ضرور بتا دیتا۔ شاید کوئی خاص وجہ ہوگی کہ اس نے بھی صدف کے رشتے کی وضاحت نہ کی۔

ایک مہینہ اور گزر گیا۔ یوں جیسے صدی گزری ہو بلکہ صدیاں بو جھل بے رنگ۔ عمر بھائی نے کوئی رابطہ رکھنا نہ پھینچو کے ہاں سے کوئی خبر ملی۔ زندگی بڑی کشمکش میں گزر رہی تھی۔ کیا ہوگا۔ اب کیا کروں۔ قسم کے خیالات کی یلغار رہتی۔ موسم بدل رہا تھا اور وہ خزاں زدہ موسم کی طرح اداسی کا نمونہ بنی ہوئی تھی۔ افضل کی آمد کا خوف ہوتا تھا کہ کب وہ اسے اپنے ساتھ لے جانے کا عزم کر لے اور اب اس کے نہ آنے سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ کہیں دو بیمار تو نہیں۔ وہاں دیکھ بھال کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ صدف ابھی آئی کہ نہیں۔ اگر آگئی ہے تو ٹھیک ہے، صدف کون ہے، افضل کی، محبوبہ دوست۔ یا اس نے اپنی محبت کی قربانی دے کر پروا کو۔ کون بتاتا۔ یہاں تو افضل کے متعلق بھی کوئی زبان نہ کھولتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سب نے اسے کچھ نہ بتانے کا عہد کر رکھا ہے اور سوال کی نوعیت کو تبدیل کرنے کے باوجود کوئی بات واضح نہ ہوئی۔

اس دن پہلی بار ڈاک سے اس کے نام ایک مونا سا لفافہ آیا۔ رجسٹرڈ وہ کچھ ڈری گئی، پھر لفافے کی پشت پر صدف کا نام دیکھ کر حیرت آمیز خوشی بھی ہوئی، اماں نے پوچھا۔

”کس کا خط ہے۔“ صدف کا نام سن کر انہوں نے اس کے ہاتھ سے خط لے لیا۔ پروا ڈری کہ اب یہ خط پھاڑ ڈالیں گی۔ مگر اماں نے خط کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کو ہونٹوں سے چھوا اور واپس پروا کو دے دیا۔

صدف کے خط سے زیادہ اماں کے طرز عمل نے حیرت زدہ کر دیا۔ اماں کے جانے کے بعد اس نے خط کھولا۔ خاصا طویل تھا۔ اب راز سے پردہ اٹھنے والا ہے۔ شاید وہ اپنی قربانی کا صلہ مانگے۔ ممکن ہے اسے اپنے راتے سے بٹنے کی قیمت دینے کی پیش کش کرے یا یہ کہ کچھ دو۔ کچھ دو کے اصول پر سمجھوتا، وہ سمجھوتا۔ کس بنیاد پر ہوگا۔ اماں جی کو اس کے حق میں ہموار کرنے۔ اسے گھر کی بہو تسلیم کرنے یا اپنی باری پر اصرار زیادہ دیر انتظار نہ ہو سکا۔ ڈرتے ڈرتے پڑھنا شروع کیا۔

خط پر بیجنگ کی مہر تھی۔ یہ خط اس نے چین کے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر تحریر کیا تھا۔ وہاں کی کچھ تصویریں بھی تھیں۔ لکھا تھا۔

”پروا! عزیز از جان ہو گئی ہو۔ وقت کم ہے اور باتیں بہت سی۔ اختصار سے شکوک جنم لیں گے۔ اس لیے تفصیلی مواد بھی ہوگا۔ سنا ہے اماں نے تمہیں قبول کر لیا ہے۔ یہ ایک ایسی حیرت انگیز خبر تھی کہ میں رو نہ سکی۔ مبارک ہو یقیناً اس میں تمہاری معصومیت اور مظلومیت کا دخل ہوگا۔ یا اماں افضل کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہیں۔ جس کا اظہار اب ہوا۔ ورنہ افضل کے لیے ان کا رویہ بہت سخت تھا۔ اس نے اماں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ شاید افضل میں کچھ عقل آگئی ہے اور

تمہیں اماں کے پاس چھوڑتے ہیں یہ مقصد مد نظر رہا ہوگا کہ وہ تمہاری معرفت ہماری خطائیں بھی معاف کر دیں۔ پیاری پروا۔ وہاں شاید کسی نے میرے بارے میں کب کشائی نہ کی ہوگی۔ میرا نام اس گھر اس گاؤں کے لیے ایک گالی بن گیا ہے۔

میں تمہیں بتاؤں گی کہ کس طرح۔ جس طرح ہر کہانی ایک مرکز کے گرد گھومتی ہے۔ اسی طرح میری کہانی ضد کے گرد۔ میری بربادی کا مرکز۔ میری ضد اماں کی ضد اور افضل کی ضد ہے۔ میں واقعی لائق سزا ہوں۔ مگر افضل نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ پھر بھی میرے ساتھ اسے بھی سزا کاٹنی پڑ رہی ہے۔ کیوں۔

میں نے اماں کی مرضی کے خلاف شہر میں تعلیم حاصل کی اور اپنی ضد اور خود سری کی بدولت اماں کے طے کیے رشتے سے انکار کیا۔ ہاں بھئی۔ ابا کے کئی بھتیجے ہیں زمیندار ہیں ان کی بہن کو افضل کے ساتھ اور مجھے زمیندار کے پلے باندھنے کا منصوبہ تھا جو میں نے اور افضل نے ریجیکٹ کر دیا۔ ناراضگی تو ہوئی تھی۔

پھر میرا ایر ہو سٹس بننا بھی اماں کے وقار پر ضرب کے مترادف ہوا۔ اماں کو عورتوں کا مردوں کے ساتھ کام کرنا خاندانی ذلت نظر آتا تھا۔ اماں مجھ سے خنا ہوئیں تو مجھے گھر سے بے دخل کر دیا گیا۔ پھر بھلا افضل کو یہ کیسے گوارا ہوتا کہ میں شہر میں تنہا رہوں، ہم بچپن سے ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے بہن بھائی۔ شاید تمہیں افضل نے بتایا ہو۔ ہم دونوں جڑواں ہیں۔ ہم دونوں کو عادات اور فطرت بھی ملتی جلتی ہے اور جس طرح میں سوچتی ہوں۔ افضل وہی کر گزرتا ہے۔ اماں چاہتی تھیں میں شہر میں اکیلی رہوں۔ درد بھٹکوں تاکہ مجھے اس گھر کی قدر ہو جو اماں کے نام ہے جہاں اماں کا سایہ ہے تحفظ ہے ہاں مانتی ہوں میں مگر کیا آج کی دنیا میں عورتیں گھر سے باہر رہ کر کوئی کام نہیں کرتیں۔

افضل نے مجھے سہارا دیا مدد کی۔ ایک گھر لیا سروس کی۔ اسے سروس کی ضرورت نہ تھی۔ ابا کی اتنی زمینیں تھیں بہت اچھی گزر بسر ہو رہی تھی لیکن اماں کی ضد نے ہم دونوں کو گھر بدر کر دیا۔ میں نے شادی سے انکار کیا تو افضل نے بھی انکار کر دیا۔ وہ بھی پڑھی لکھی شریک حیات چاہتا تھا۔ شاید ابھی میں تم کو خط نہ لکھتی مگر۔

امریکہ کے قیام میں مجھے میرا آئیڈیل مل گیا کتنی عجیب بات ہے کہ جب میں اپنی من مانی کرتی تھی تو مجھے اماں کی ہٹ دھرمی پر بڑا غصہ آتا تھا اور میں سوچتی تھی کہ میں خود اس قابل ہوں کہ اپنی زندگی کے فیصلے کروں۔ اپنی زندگی بناؤں۔ اماں پر مجھے ذرا اعتماد نہ تھا۔ افضل کے ساتھ تو اتفاق ایسا ہوا کہ اسے اس کی منہ پسند شریک حیات مل گئی مگر میں بہت سوچ سمجھ کر اپنا ساتھی چنا چاہتی تھی۔

اب وہ مل گیا ہے تو اماں کی اہمیت ان کے تحفظ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کاش اماں مجھ پر مہربان ہو جائیں!

میری ساری خطائیں نادان بچے کی ضد سمجھ کر معاف کر دیں، اماں میں اتنا ظرف ہے، مامتا بھی ہوگی، جسے انہوں نے اپنی ضد کے پردے میں چھپا لیا ہے، افضل کا یہ قصور کہ اس نے میرا ساتھ دیا۔ میں جو سزاوار تھی اماں سے مقابلہ کر بیٹھی تھی۔ میری خاطر اس نے گھر چھوڑا۔ ماں کی خفگی بھی سہہ لی۔ میں حیران ہوں کہ انہوں نے تم کو میرا انتخاب سمجھ کر کیوں قابل نفرت نہ جانا۔ ان کی یہ نرمی ہی امید میں مبتلا کرتی ہے۔

میری قسمت بھی عجب ہے جسے میں نے اپنا نصیب بنایا۔ وہ پہلے ہی کسی کی مانگ نکلا۔ اس کے ساتھ بھی اتفاق ہی ہوا تھا۔ جب ازراہ ترحم اس نے اپنی کزن کے ساتھ منگنی کر لی۔ بعد میں اسے احساس ہوا کہ شاید وہ اس کی محبت نہیں ہے۔ اس نے اپنی ماں کو لکھ تو دیا ہے کہ اسے اس بندھن سے آزاد سمجھیں۔

میں چین آگئی تھی پتا نہیں اس کی ماں نے کیا جواب دیا۔ پروا! ہم سب اسی طرح ایک زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں۔ شاید تم بھی کسی اور کی بنائی جانے والی تھیں۔ بسمہ کی نفرت نے تمہیں تیسرے راستے پر لا ڈالا۔ جہاں افضل کھڑا تھا۔ میرا بھائی، میرا ماں جایا۔ میرا سب سے عزیز دوست، یقین کرو۔ اس سے بہتر انسان اس سے زیادہ چاہنے والا تمہیں کہیں نہیں ملے گا۔ اس کے خمیر میں محبت گوندھی گئی ہے، ورنہ بہن کے لیے کوئی اتنا بڑا ایثار کرتا ہے۔ تم اور وہ ایک دوسرے کے لیے ہی بنائے گئے ہو، اسے اپنا نصیب، اپنا اعزاز، اپنا انعام جانو۔ اس انعام کے صدقے میں میری ایک گزارش ہے، میرا ارمان، تمنا، آرزو، خواہش، سب کچھ۔ الفاظ نہیں ملتے کہ میں شدت اور یقین کے ساتھ اظہار کروں۔ میں چاہتی ہوں، میری رخصتی میرے بابل کے آنگن سے ہو، ماں کی دعاؤں کے سائے میں، ماں کی مرضی اور اقرار کے بعد۔ اس کی خواہش کے مطابق۔ اگر اماں مجھ سے راضی نہ ہوئیں۔ تو میں ساری زندگی یوں ہی گزار دوں گی۔

میں جو گاؤں سے ترقی کے لیے باہر نکلی تھی۔ خود کو بڑا ایڈوانس خود مختار سمجھتی تھی۔ آج احساس ہوتا ہے، میں اندر سے ابھی تک وہی دیہاتی پینڈو لڑکی ہوں۔ جو بابل کے آنگن کے چڑیا ہے، اسے ماں باپ ہی ہنکا کر کسی دوسرے آنگن کی رونق بنائیں۔ ماں کی مامتا کے بغیر۔ اپنے گاؤں سے دور میں کتنی اکیلی ہوں۔ کس قدر غیر محفوظ ہوتی ہوں۔ اس کا اظہار پہلی مرتبہ کر رہی ہوں۔

اماں کے منتخب کردہ رشتے سے انکار میرا حق تھا لیکن اپنی آرزو کو صرف اپنا معاملہ، اپنی زندگی کا فیصلہ قرار دینا غلط ہے، اس کا حق میری ماں کو ہے، اگر وہ اسے ریجیکٹ کر دیں تو یہ ان کا حق ہوگا۔ اور میں اس کی پابندی کروں گی کہ یہ میرا فرض ہے، میں اب ضد کر کے حق منوانے والے فارمولے سے اکتا گئی ہوں، اس کے نتائج، کچھ بہتر نہیں نکلے۔

ہاں تم میری مدد کرو گی نا۔ اماں سے سفارش، میرا کوئی احسان تم پر نہیں ہے تمہاری قسمت افضل کے ساتھ تھی۔ تب

ہی دوستارے ٹکرا گئے، لیکن اس ٹکراؤ میں میرا بھی کچھ ہاتھ تھا۔ اس تعاون کے صدقے میں ہی میرا کام کر دونا۔  
اماں کو میری جاب بھی گوارا نہ تھی۔ میں اسے بھی چھوڑ کر آ رہی ہوں کیونکہ اب میں خود کو ترقی یافتہ بنانے کے بجائے اپنا گھر بنانا چاہتی ہوں۔ عزت، عزت نفس اور انا کی بلندی کے ساتھ۔

”اسے“ بھی میری جاب گوارا نہیں دراصل وہ بھی پینڈو ہے امریکہ میں دس سال کے قیام نے اس سے وہ مشرقیت نہیں چھینی۔ جو ہمارا ورثہ ہے۔ غیرت، عورت کی کمائی، غیرت کے لیے تازیانہ۔ ایک پینڈو یا مشرقی روایات کے پابند مرد کے لیے۔ یہ جو اونچی ناک والے مرد ہوتے ہیں نا۔ اپنی برتری کے لیے یہ نمائش ضروری سمجھتے ہیں۔ جذباتی تسکین کے لیے کہ وہ خود کفیل ہیں۔

پروا! خط لمبا ہو گیا۔ تم سمجھ گئی ہو گی۔ مجھے اپنے میکے کے افتخار کی ضرورت ہے، صحن کی کچی مٹی کی خوشبو، کھیتوں کی ہریالی کی مہک۔ میں اس استحقاق کے حاصل کرنے کی حقدار ہوں (اماں کے خیال میں نہ ہوں گی) صبح کا بھولا ہوا ستارہ ہوں۔ اپنے صحن میں چمکنا میرا حق ہے۔ اماں کو سلام اور افضل کو پیار۔

تمہاری صدف۔“

عجیب تاثر انگیز تحریر تھی۔ پروا کے آنسو آنکھوں کی حد سے باہر آ گئے۔ اماں اسے روتا دیکھ کر بے قرار ہو گئیں۔  
”کیا ہوا ہے۔ صدف ٹھیک تو ہے۔ کیا لکھا ہے اس نے۔ کیسی ہے وہ۔“

یہ وہ اماں نہ تھیں۔ جو صدف کا نام لینا بھی گناہ سمجھتی تھیں۔ ان کے دل میں مامتا کے سوتے پھوٹ رہے تھے وہ خط پڑھ کر پروا کو روتا دیکھ کر اندر سے خوفزدہ تھیں۔

”کہیں صدف کو کچھ ہو تو نہیں گیا۔ اس کا جہاز گر تو نہیں گیا۔ زخمی ہو گئی کیا۔ پروا کیوں رو رہی ہے۔ جواب نہیں دیتی۔ ضرور کچھ ہوا ہے۔ مر تو نہیں گئی۔“ ان کا دل زور سے اچھلا۔ پھر انہوں نے یقین کر لیا۔ ضرور کچھ ہوا ہے۔ ایسی نافرمان اولاد کا یہی انجام ہوتا ہے، کتنا کتنا منع کیا۔ نوکری نہ کر مگر اسے جہاز میں اڑنے کا شوق تھا۔ لو لے گیا اڑا کر شوق اسے۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ دنیا دیکھ لی دنیا۔ ارے اپنا گھر آنگن، اپنا بسیرا چھوڑ کر۔ کوئی دوسری دنیا کی سیر کرنے جاتا ہے۔ ماں کو خفا کر کے، گھر کا آنگن سونا کر کے ہائے امید تھی کہ پھر بھی کبھی اسے ماں کی یاد آئے گی۔ صحن میں لیٹ کر آسمان دیکھنے کا کتنا شوق تھا۔ پھر یہ شوق اور اوپر لے گیا اور اوپر۔ اب۔ اب کہاں گئی، میرا آنگن سونا کر کے میری گودا جاڑ کے ہائے میری صدف! میری بچی۔ تجھے دنیا نے میری آنکھوں سے دور کر دیا۔ اب کہاں پاؤں تجھے۔ کیا دیکھوں تجھے، کیسا ارمان تھا۔ بارات آئے آنگن میں ڈھول بجے اور میں لال ستاروں والے دوپٹے میں اسے رخصت

کروں ہائے کدھر رخصت کروں۔ کیا کروں۔

ان کا صبر رخصت ہو رہا تھا۔ پردا کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اماں نے اس کی خاموشی کو کُن معنی میں لیا تھا۔ وہ ان سے لپٹ لپٹ گئی۔

”نہیں اماں۔ یہ بات نہیں وہ آ رہی ہے۔ نوکری چھوڑ کر۔ آپ کو جو پسند نہیں تھی۔ آپ کو خفا کر کے جانے کا اسے بہت دکھ تھا نا۔ اماں صدف آپ آ رہی ہیں اور ان کی شادی کریں گے، یہیں بارات آئے گی، یہیں ڈھول بجیں گے۔ سچ اماں آپ بس لڑکے کو دیکھ کر اقرار کر لیں تو۔“

اماں نے پھرتی سے آنسو پونچھے۔ ”اچھا تو کوئی بُرٹل گیا ہے تب ہی ماں کی یاد آئی۔ نوکری چھوڑ کر آئے گی۔ اس مردوئے نے منع کیا ہو گا نا۔ تب ہی احسان میرے سر پر واہ۔ مارے جوتیوں کے کھوپڑی، پلپلی نہ کر دی تو۔ آ کے تو دیکھے، کیا حشر کرتی ہوں میں۔“

اماں بالکل پٹری سے اتر گئی تھیں۔ پردا کو ہنسی آئی تو وہ کمرے میں گھس گئی اور دوبارہ خط پڑھتی رہی دماغ میں کوئی خون کی رگ سرسرا رہی تھی۔ یقیناً کوئی بات تھی۔ اب صدف آپا کے وڈ جو برسوں سے امریکہ میں ہیں اور مشرقیت کی روح کو فنا نہیں کر سکے۔ شاید سارے مرد ایسے ہی ہوں۔

کیا جنیب اتنے فراغ دل ہو سکتے ہیں کہ اسے پھر سے قبول کر لیں۔ ایک سسرال میں رہنے والی لڑکی کو جس کی شادی کو بھی کئی ماہ ہو چکے ہیں۔ کون ہو گا ایسا۔ کیسے یقین دلائے گی، میں تمہاری امانت ہوں۔ اگر سوری کہہ کر گزر گئے تب کیا عزت ہوگی۔ ان پر پورا بھروسہ تو پہلے بھی نہ تھا۔ اب تو۔ وہ بھی اپنا حق استعمال کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ جب تو پیپھو کے اصرار پر۔ بھابھی سے بچانے کی خاطر منگنی کر لی تھی۔ شاید اب اسے بچانے کی ضرورت نہ سمجھیں۔

پھر وہ لوگ جو قدردان ہیں عزت کرتے ہیں۔ مان رکھتے ہیں۔ اسے تحفظ دیا۔ نام دیا۔ ان کا کیا قصور کہ انہیں مایوس کیا جائے۔ شاید پیپھو کے کہنے پر اسے قبول بھی کر لیں۔ تو عزت تو نہ ہوگی۔ وہ بات تو نہ ہوگی اور خود بھی وہ اپنی نظر میں گر نہ جائے گی۔ اپنے وجود سے متنفر یہ حادثہ منگنی والا حادثہ پھر شادی کی نام نہاد تقریب جہاں صدف نے اپنی آغوش میں چھپا لیا تھا اور وہ حادثہ جب اس کی رخصتی ہوئی۔ اس کو یادگار بنانے کے لیے۔ پائیڈار بنانے کی کوشش اٹگوٹھی انگلی میں بری طرح پھنس چکی تھی۔ شاید میں موٹی ہو گئی ہوں۔ خالص دودھ دہی گاؤں کی خالص ہوا اور محبتوں کے پیراہن۔

بمشکل اٹگوٹھی اتار کر ڈبے میں بند کی اور الماری کے کونے میں ڈال دی۔ ہوا میں اچانک ہی سرسرا نے اور نغمے

سنانے لگیں، بوجھ اتر جائے تو روح بھی گنگناتی ہے۔ جسم بھی تروتازہ اور آنکھیں چمکنے لگتی ہیں۔ ہاں اب کوئی بوجھ نہ تھا۔ کسی کے احسان کا۔ نہ کسی کے انتظار کا۔ ”اب کیا ہوگا۔“ والی کیفیت کا فوراً کی بوکی طرح اڑ چکی تھی۔

اب یقین کا آسرا تھا۔ اس یقین کا جو اس کے دل نے گواہی میں دیا تھا۔ بس سب کچھ یہیں ہے اسی جگہ اپنائیت کا لمحہ سرسرا تا ہوا گزر رہا ہے۔ تحفظ اور اعتماد زندگی میں اس کے سوا اور کچھ نہیں اور وہ ان لفظوں کے معنی مطلب سے آگاہ ہو گئی۔ ان کی حرمت پہچان گئی۔

اسے لگ رہا تھا وہ بہت کار گزار اور با اختیار ہے سب کچھ کر سکتی ہے اماں جیسی سخت گیر اس کے سامنے حباب کی مانند ہو جاتی ہیں۔ صدف کی شادی کرانے کا عزم کیا ہے تو کرا کے ہی رہے گی، پچھلی زندگی خواب تھی اور خواب بھولنے کے لیے ہوتے ہیں۔ اماں نے اسے اقتدار کے تخت پر بٹھا دیا تھا۔

جئے جئے جئے

شام کو افضل آ گیا۔ بہت تھکا ہوا تھا۔ مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ پروا کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کی انگلی بالکل خالی تھی۔ ایک ٹائیے میں دیکھ لیا تھا اس نے۔

”جاہو۔ افضل کے لیے لسی لے کر آ۔“

وہ کچن کی طرف دوڑ گئی۔ پانچ منٹ بعد چائے لیے نمودار ہوئی تو اماں خفگی سے بولیں۔  
 ”لسی لانے کو کہا تھا باؤلی۔ شہر میں کب نصیب ہوتی ہے لسی۔ چائے تو خون جلا دیتی ہے۔“  
 افضل شوخ نگاہوں سے پروا کو دیکھ رہا تھا۔

”اماں! آپ کی بہو آپ سے زیادہ مجھ سے واقف ہے۔ لسی پی کر تو سستی چڑھ جاتی ہے سست مرے ہو جاتا ہے بندہ چائے رگوں میں بجلی دوڑا دیتی ہے۔“  
 ”چل دوڑا لے بجلی۔ خون جلا کر۔“

اماں ہنس پڑیں۔ افضل نے حیران ہو کر اماں کو دیکھا۔ پروا کو پاس منہ لے جا کر سرگوشی کی۔  
 ”جادو کر دیا ہے میری ماں پر۔ ان کے حکم کی خلاف ورزی ہو اور وہ ہنس پڑیں۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔“  
 پروا نے منہ پھیر لیا اور مسکرا دی۔

اماں نے شبراتن سے کہا کہ افضل کے لیے صاف بستر بچھائے رات یہیں سوئے گا۔  
 ”اماں کو کیسے خبر ہوئی کہ میں رات رہنے کے لیے آیا ہوں۔ میں نے تو کچھ بتایا نہیں۔“



”وہ ماں ہی کیا۔ جو اولاد کی خواہش نہ جان سکے۔“ اماں سر دلچے میں بولیں۔

”تو اس سے پہلے کیا آپ ماں نہ تھیں؟ میں اور صدف آپ کی اولاد نہ تھے۔“ وہ بکڑ گیا۔

”ہٹ پرے۔ جا صدف کو بلا لے آنکھیں ترس گئی ہیں۔ میرے گھر میں اب اس کی بارات آئے گی۔“

افضل وہشت زدہ ہو گیا۔ اماں کے پاس بیٹھ کر بڑبڑانے لگا۔

”اماں۔ اماں یہ آپ کہہ رہی ہیں۔“

”ہاں میں کہہ رہی ہوں تم لوگوں نے مجھے پتھر سمجھ لیا تھا اور مجھ سے ہٹ کر چلا کرتے تھے کہ کہیں تمہیں ٹھوکر نہ

لگ جائے بچ بچ کر قدم اٹھاتے تھے پر میں انسان ہو بیٹا۔ ماں ہوں۔ اختیار والی ہوں۔ کب سے انتظار کر رہی تھی۔ کوئی

مجھے کمزور بھی سمجھے میری مامتا کا اقرار کرے میرے احکام کو حق سمجھے مجھے دلیلوں سے نہیں پیار سے لجاجت سے‘ ضد سے

نہیں‘ محبت سے جگائے ارے تم لوگ بے وفا بے مہر۔ ہاں یہ تو میری بہو ہے جس نے میرے سارے ارمان پورے

کیے میری بہو نے میری بیٹیوں سے زیادہ میرا مان رکھا۔ فرشتی ہے فرشتی جیسا چاہتی تھی وہی ملا ہے مجھے تم اس قابل کہاں

تھے پر خیر صدف نے جو کچھ کیا ہے تیری شادی وادی کرا دی۔ تو میں اب ایسی سنگدل بھی نہ تھی کہ اب بھی اسے معاف نہ

کرتی پھر میری بہو کی سفارش کیسے ٹالوں۔“

خوب تو یہ کارنامہ ان محترمہ کا ہے کمرے میں تازہ دگلاب کا گلدستہ مہک رہا تھا۔

اور محترمہ کے قریب سے عجیب اور فسوں خیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ یقیناً اماں نے پچھتر سال پرانا اصلی اور خالص عطر

نکال کر چھپتی بہو کے لگایا ہے اس پر وہ باسکٹ سے چھنا چھن چوڑیاں نکال نکال کر پہن رہی تھی چڑیوں کی جھنکار سننے

عرصہ ہو گیا۔ سنائے میں یہ کسی دلکش نغمے کی دھن کی طرح سماعت میں رس گھول رہی تھی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے۔“ اس نے ڈپٹ کر پوچھا۔ بیوی پر رعب جما کر ہی تسکین ملتی ہے مردانگی کو۔

”چوڑیاں پہن رہی ہوں۔“ وہ سہم گئی۔ اے خدا کہیں انہیں ناپسند ہوں تو۔

”کیوں۔“

”آ۔ آ۔ اماں نے کہا تھا کہ۔ کہ پہن لو۔ ہاتھ خالی ہیں۔ اچھے نہیں لگتے۔“

”خوب غلامی کے حلقے خوشی سے پہنتی ہو تم لوگ اچھا۔ اور یہ خوشبو کیوں لگائی پچاسی سال پرانی۔ کہہ دو اماں

نے لگا دی۔“

”جی۔ جی۔ جی۔ جی۔ جی۔ جی۔“

”کیوں۔“

”پتا نہیں جی وہ تو روز لگا دیتی ہیں۔“

”اچھا تو اس تابعداری سے میری ماں پر جادو ڈالا ہے۔“ دانت چمکانے لگا۔ طنزیہ۔

”ادھر آؤ۔“ پھر وہی رعب۔

”کیوں۔“ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اب چوڑیوں کی شامت نہ آئے۔ ”اتار دوں۔ اگر بری لگ رہی ہیں۔“

”نہیں اچھی لگ رہی ہیں۔ ہاتھ دکھاؤ۔ وہ کہاں گئی انگلی۔ کم بخت اپنا نشان تو چھوڑ گئی۔“

پروا کا رنگ اڑ گیا۔ سانس رکنے لگا۔

”کب اتاری۔ صدف کا خط آیا تھا کیا۔“ کتنا چالاک۔

اس نے گردن سے اقرار کیا۔ ”اوہ تب ہی اتار دی مایوس ہو کر۔“

”مایوس ہو کر۔“ وہ گھبرا گئی۔ ”کیا مطلب۔“

”خیر چھوڑو تم نے کسی کو خط نہیں لکھا۔ سارے لفافے اسی طرح رکھے ہیں۔“

”خط۔ کس کو۔ کیوں۔“ زمین آسمان جھولا جھولنے لگے تھے۔

”اس کو۔“ افضل نے اپنی جیب سے خط نکالا۔ صدف کا خط تھا۔ افضل کے نام ساتھ ہی دو تین تصویریں بھی

تھیں۔ صدف اور جنب، جنب اور صدف۔ چند لمحے وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکی۔ ”ہاں خط لکھا تھا۔ یا صدف کا خط آنے کے بعد“

یہ فیصلہ کیا۔

”خط کون۔ کون۔ کس کو۔ کیسا فیصلہ۔“

”خط اسے۔“ افضل نے جنب کی تصویر کی سمت انگلی سے اشارہ کیا۔ ”اور فیصلہ انگلی اتارنے کا۔ مایوس کے

نتیجے میں۔“ بڑا برہم سا ہو رہا تھا۔

گرم گرم لبو کی دھاریں اس کے سارے جسم میں سرسرا نے لگیں۔ اس قدر طیش تھا کہ کھڑا نہ ہوا جا رہا تھا۔ وہ

بڑے بڑے دیدے نکالے گھور رہا تھا اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ اچانک آنکھوں میں ناقابل برداشت جلن سی ہوئی۔

جھمر جھمر بننے والے آنسوؤں نے سامنے پردہ سا ڈال دیا۔ خود پر قابو نہ رہا۔ وہ چیختی روتی اسے دھکا دے کر کمرے سے

بھاگی۔

افضل حیران ہو گیا۔ اور اس کے پیچھے بھاگا۔ اماں کے کمرے سے فریاد بلند ہو رہی تھی۔

اماں ابھی تک اس سے خفا تھیں۔ اب چہیتی بہو جانے کیا گل کھلائے۔

وہ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر شاید وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ وہ بھاگتی ہوئی آئی اور روتے ہوئے ان کے پہلو سے چپک گئی۔ گاؤں میں سرشام سناٹا ہو جاتا ہے اور رونے چیخنے کی یہ آوازیں شاید دوسروں گھروں تک بھی پہنچتی ہیں اگر ان کا گھر آبادی کے قریب ہوتا۔ اماں کے سوالوں کے جواب میں وہ ایسے چیخ چلا رہی تھی جیسے ناقابل برداشت درد سے بے حال ہو۔ وہ دروازے پر الزام کی نوعیت سننے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

آج تک اس کی آواز نہ سنی تھی۔ پتا نہیں کہاں سے مانگ لائی صور اسرافیل۔

”اماں۔ اماں آپ کا بیٹا۔“ وہ ہچکیوں پر ہچکیاں لے رہی تھی۔ ”آپ کا بیٹا مجھ پر الزام لگاتا ہے کہ میں..... میں خط لکھتی ہوں۔ غیر مردوں کو میں کیوں لکھوں گی خط۔ مجھے یہاں کیا تکلیف ہے جو میں کسی کو خط لکھوں گی۔ میں کوئی آوارہ ہوں۔ بدچلن ہوں۔“

اماں نے دروازے پر تیز نگاہ ڈالی۔ بوکھلائے ہوئے افضل نے اندر داخل ہونا چاہا تو اماں نے اپنی چپلیں اٹھا کر دے ماریں۔ جو افضل کے سینے پر لگیں۔

افضل ندامت سے کھڑا پروا کو گھور رہا تھا۔ پھر اس نے پروا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ارے او۔ بد قسمت۔ تو اس قابل ہی نہیں کہ تجھے معاف کیا جائے۔“ اماں نے چلا کر کہا۔

”چھوڑ میری بہو کا ہاتھ۔ توڑے گا۔ چل بیٹی۔ یہ جو کرتا ہے کرتا رہے تو آجا میرے پاس میرے ساتھ رہنا عادت ہو گئی ہے مجھے تیری اور خبردار جو تو نے آئندہ اس سے بات بھی کی دفع ہو میری بیٹی میرے پاس رہے گی تو جا اپنے گھر۔ تجھے قدر ہی نہیں ہے اس موتی کی۔ الزام لگاتا ہے۔“

”اماں میں تو مذاق۔“

”مذاق۔ ارے یہ کیسا مذاق ہے۔ بیوی کی قدر نہ کر۔ مگر بے عزتی کرنے کا کیا حق ہے۔ بول۔ اپنی ہی بے عزتی ارے غیرت کیا شہر میں گھول کر پی جاتی ہے۔ ذرا لاج نہ آئی۔ میری بہو میرے خاندان کی عزت۔ اسے مذاق کے نام سے۔ مذاق۔ تو ہینا ہے یہ بے شرم۔ چل دور ہو۔ میری بہو میرے پاس ہی ٹھیک ہے تو اس قابل ہی نہیں کہ کسی شریف زادے کے ساتھ گھر بسائے۔“

اماں جب بولتیں تو کوئی چپ کرانے کی ہمت نہ کرتا۔

حادثے تو پروا کے ساتھ بہت ہوئے وہ حادثوں کے ساتھ ہی قدم قدم چلتی رہی لیکن وہ حادثہ تو ایسا دلکش

روح پرور اور دلچسپ تھا کہ جب بھی یاد آتا جسم میں سنسناہٹ اور گدگدائی سی ہونے لگتی اور بے اختیار ہنسی کے فوارے چھوٹنے لگتے۔

جب گھبرائے ہوئے افضل نے پروا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر کھینچا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ دبایا کہ وہ آواز بند کرے دوسری طرف پروا نے اماں کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور اماں نے پروا کو تھام رکھا تھا۔ افضل پروا کو کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اماں نے۔ اگر دوسری بار وہی جملہ دہرا دیے تو وہ تو اس فرشتی سے کبھی مل ہی نہ پائے گا۔

آخر کار افضل کے مردانہ بازوؤں کو فتح ہوئی۔ وہ انہیں کھینچ لینے میں کامیاب ہوا۔ مگر ایسے جھٹکے سے کہ زمین پر جا گرا۔ اس پر پروا آکر گر کر اور پروا کے اوپر اماں کا نازک بدن۔ افضل دونوں کے نیچے دبا ہوا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ مگر اس نے پروا کو چھوڑا نہیں۔ پھر چند لمحوں بعد جب جسموں کی زنجیر کہیں سے الگ نہ ہوئی تو اماں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ پروا جو سنسنی خیز مقابلے میں سینڈوچ بنی پڑی تھی۔ قہقہے لگانے لگی۔ پھر افضل کے بلند آہنگ قہقہے بھی شامل ہو گئے۔ گاؤں کے سناٹے میں دور دورا ان کی ہنسی کے جلت رنگ بجتے سنائی دے رہے تھے۔

